جلد ۱۳۳ ماہ جمادی الاولیٰ و جمادی الثانی مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۴ء عدد ۳

مضامین

شذرات

کراچی کے سفر میں "مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی ﷺ تصور ریاست اسلامی" میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا جو ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے جناب حکیم محمد سعید کے اہتمام میں ۱۴ر دسمبر سے ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء تک ہوتا رہا، جناب حکیم محمد سعید کو بڑی بڑی بین الاقوامی کانفرنسوں اور مذاکروں کو انتہائی خوش سلیقگی سے انجام دینے اور دلانے میں غیر معمولی وصف حاصل ہے، اس مذاکرہ میں بھی ان کی میزبانی کی رعنائی ہر طرف دیکھنے میں آئی، ہندوستان کے نمائندوں میں اس خاکسار کے علاوہ ڈاکٹر مشیر الحق صدر شعبۂ اسلامیہ جامعہ ملیہ دہلی بھی تھے، پاکستان کی نمائندگی پورے طور پر تھی جس میں سابق وزراء بھی تھے، سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس بھی، ہائی کورٹ کے جج بھی، ممتاز قانون داں بھی، علماء بھی، یونیورسٹی کے اساتذہ بھی اور صحافی بھی، اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی، کہ جو مضامین پڑھے جاتے، ان کے خلاصے دوسرے دن جریدۂ ہمدرد میں چھاپ کر اجلاس میں تقسیم کر دیئے جاتے،

اس خاکسار نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ معارف کے زیر نظر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین ہے مولانا کوثر نیازی سابق وزیر حکومت پاکستان کے مقالۂ اسلامی سیاست میں جماعتیں کے ایک خصوصی اجلاس کی صدارت بھی تفویض کی گئی، مقالہ پر سوال و جواب کے سلسلہ میں بڑی تلخی پیدا ہونے لگی تو اپنے صدارتی اختیار سے جلسہ کو ختم کرنا پڑا، جس سے کچھ نمائندوں کو ناگواری بھی ہوئی،

اسلامی ریاست کی تلاش و تحقیق سے یہ الزام آتا ہے کہ اب تک مسلمانوں کی ریاست اور سیاست کسی تصور کے بغیر چلتی رہی، اس سے کیسی اہانت ہوتی ہے، اسلام میں سارے سیاسی تصورات موجود ہیں،

ان کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، دین کا دامن ہاتھ میں ہو تو جمعیت اور ملت کی تشکیل میں کوئی دشواری نہیں، اور جب دین نہیں تو جمعیت کے ساتھ ملت اور سیاست بھی رخصت ہو جاتی ہے، ایمان خلیل اگر نہیں تو زندگی کا ہر پیرہن خاکستر ہے، جہاں اور جس ملک کا وجود سراپا تجلی افرنگ ہو گا، وہاں ہر زمانہ میں ذہن کی مسکینی اور محکومی کے ساتھ ناامیدی جاوید رہے گی، پھر تصور ریاست کیا زندگی کی سانس کی بھی تلاش جاری رہے گی، لیکن اگر دل خبیر اور بصیر ہو تو فرنگیوں کا دیو بے زنجیر بھی مجبور بن سکتا ہے،

اس مذاکرہ ملی کے درمیان جناب حکیم سعید صاحب نے اپنے مجوزہ ادارہ مدینۃ الحکمۃ کا سنگ بنیاد نہایت شاندار طریقہ سے اپنے نامور برادر بزرگ جناب حکیم عبد الحمید سے رکھوایا، اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ مذاکرہ ملی کے ہر نمائندہ اور شہر کے اکابر سے بھی بنیادی اینٹیں رکھوائی گئیں، اور ان سب کے نام پہلے سے دیوار پر کندہ تھے، اس کے لئے طرح طرح کے اداروں کی تعمیر میں جو کثیر اخراجات ہوں گے، ان سے جناب حکیم سعید کی سعی پیہم کی ترانوے کم و کیف حیات کا اندازہ ہوتا ہے،

کراچی کے قیام میں ۲۶ر دسمبر ۱۹۸۳ء کی رات میرے لئے بڑی دلنواز بن گئی، میری نواسی کے ختم قرآن اور میرے نواسہ کی بسم اللہ خوانی کی تقریب میں جناب حکیم محمد سعید اپنے اسٹاف کے ساتھ میری لڑکی کے گھر پر تشریف لائے، اس موقع پر جناب اے کے بروہی سابق وزیر حکومت پاکستان، جناب نبی بخش بلوچ سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی، مولانا ظفر احمد انصاری رکن اسلامی نظریاتی کونسل، جناب نعام الحق سکریٹری جنرل موتمر اسلامی، جناب مسرت حسین زبیری آئی سی ایس، جناب ڈاکٹر محمد بقائی، جناب مختار زمن جناب شریف المجاہد ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی، پروفیسر ڈاکٹر اقوام اللیث صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر ڈاکٹر حسین جعفری، پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم، مولانا عبد القدوس ہاشمی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا غلام محمد، مولانا رشید الحسن ندوی، مولانا فضل ربی ندوی، جناب صلاح الدین اڈیٹر جسارت، جناب علی محمد مالک پاکولا، اور ایسی مشر دیات جناب جی الا،

مولانا عبدالشکور فاضل دیوبند، جناب لطف اللہ خاں، جناب شان الحق حقی، جناب محی الحق، جناب صبیح محسن، جناب معین الدین اور جناب افضال مبین نے شرکت کر کے میری عزت افزائی کی، کچھ شعرائے حاضرین کو اپنے کلام سے بھی نوازا، اس باوقار اجتماع کی قندیل ذہن میں برابر فروزاں رہے گی، شرکاء کے نام قصداً لکھ دیئے گئے ہیں کہ یاد رہیں،

۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں تاریخ نویسی کے موضوع پر بولنے کیلئے مدعو کیا گیا، اس کا جلسہ ضیا کے مشہور ہال میں ہوا، انجمن کے صدر جناب جمیل عالی، اس کے سکریٹری جنرل جناب نجم الحسن جعفری اور ان کے دست راست جناب ضیاء الدین صاحب نے ہر طرح کی تواضع کی، جب بول چکا تو سوال و جواب میں، اس پر بڑی گرم بحث رہی کہ بادشاہت اسلام میں جائز ہے کہ نہیں اور تاریخ نویسی میں معروضیت کس حد تک ضروری ہے، خاکسار کی تقریر کے معاوضہ میں انجمن کی روایات کے مطابق ایک ہزار کی رقم پیش کی گئی، اس کو قبول کرنے کا اصرار بڑھا تو یہ رقم پھر انجمن کو اپنی طرف سے ہدیہ کر دی، جناب نجم الحسن جعفری نے انجمن ترقی اردو کے دفتر میں بھی دوسرے دن بلایا، اس کی ساری سرگرمیوں کی تفصیل بتائی، پھر ایک رات اپنے گھر پر جناب خالد اسحٰق ایڈوکیٹ، جناب جمیل عالی، جناب ابن الحسن اور جناب مشفق خواجہ صاحب سے ملنے ملانے کا موقع فراہم کیا،

۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو شمالی ناظم آباد کی بزم ہمایوں کی طرف سے مدعو تھا، اس کے جنرل سکریٹری جناب افضال مبین بڑے فعال اور متحرک ہیں، اور مشکل سے مشکل کام انجام دینے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں، یہ نشست ڈاکٹر محمد شریف کے دولتکدہ پر ہوئی جس میں کئی بنکوں کے صدر اور نائب صدر، ہائی کورٹ کے جج، یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے معززین شریک ہوئے، اس کی صدارت پاکستان کے مشہور ایڈوکیٹ جناب خالد اسحٰق صاحب نے کی، اس میں زیادہ تر تقریریں اس پر تھیں کہ ہمارا معاشرہ کس طرح اچھا بن سکتا ہے، اس موقع پر جناب افضال مبین نے دارالمصنفین کی مطبوعات کی ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا،

ایک روز ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ڈائرکٹر اردو لغت بورڈ نے اپنے نئے دفتر کی رسم افتتاح کے موقع پر مدعو کیا، یہاں مولانا جمال میاں فرنگی محلی کی زبانی ذکر رسول سننے کی سعادت حاصل ہوئی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے

اپنی مستعدی، تندہی اور عرق ریزی سے اردو لغت کو چھ جلدوں میں مرتب کرایا ہے، یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس پر نہ صرف اردو زبان بلکہ علم و ادب کو بھی ناز ہو سکتا ہے،

کراچی کے اس قیام میں شب و روز بڑی پُرکیف مشغولیتوں میں گذرے، ایک روز پاکستان کے مشہور شاعر جناب شان الحق حقی نے اپنے یہاں بلا کر کراچی کے ممتاز دانشوروں سے ملایا، اُن کے گھر کے اس اجتماع میں جناب آل احمد سرور میر مجلس بنے رہے، جناب خالد اسحٰق صاحب نے دوسرے دن اپنے دولتکدہ پر مدعو کیا جس میں کچھ ارباب علم و فضل بھی شریک ہوئے، وہ بڑے مہمان نواز ہیں، اپنی فیاضی اور خاطر داری میں اپنے دسترخوان کو پرتکلف بنانے کے ساتھ اپنی بذلہ سنجیوں اور نکتہ پروریوں سے پرکیف اور پرلطف بنا دیتے ہیں، ان کے یہاں کی نشست میں علمی، ادبی اور مذہبی گفتگوؤں کی کوئی کبھی ادھر ادھر جھلکی رہتی ہے، پھر بھی وہ اپنی ظریفانہ گفتگو سے اس کو زعفران زار بنا کر اپنی شخصیت میں رعنائی و دلبری پیدا کر دیتے ہیں، ان کی ذاتی لائبریری میں ستر ہزار کتابیں ہیں جو ان کے ہر کمرہ میں دکھائی دیتی ہیں، ان ہی کے بیچ میں بیٹھ کر شستہ بیانی اور شیریں کلامی کی مے دو آتشہ اور سہ آتشہ کے ساغر و مینا چھلکتے رہتے ہیں،

ایک رات پاکستان کے بذلہ سنج یا ابن ندیم جناب مشفق خواجہ کے یہاں نشست ہوئی جس میں پاکستان کے مشہور شاعر دلنواز، ادیب اور کہنہ مشق کالم نویس جناب جمیل عالی، کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور تاریخ ادب اردو کے لائق مصنف جناب جمیل جالبی، اکونومسٹ کے سابق اڈیٹر ابن الحسن، کراچی کی بہت ہی دلآویز شخصیت جناب مختار زمن اور مشاہیر کی آوازوں کو کیسٹ میں محفوظ کرنے کے ماہر جناب لطف اللہ خاں بھی شریک تھے، یہ مجلس علم و ادب کے محبوبوں کی تھی، ان محبوبوں کے محبوب خود مشفق خواجہ بنے ہوئے تھے،

ایک رات جناب لطف اللہ خاں صاحب کے یہاں بھی نشست رہی، جن کی بیگم صاحبہ نے اپنی خوش سلیقگی سے اپنے فلیٹ کو مینو نظر بنا رکھا ہے، وہاں انگریزی کے مشہور اخبار ڈان کے چیف اڈیٹر جناب احمد علی خاں صاحب اور ان کی مشہور افسانہ نگار بیگم ہاجرہ مسرور سے بھی ملنے کا موقع ملا، یہ خاکسار ڈان اخبار کا ممنون ہے کہ اس میں اس کے متعلق دو تحریریں شائع ہوئیں، ایک تو جناب محمد علی صدیقی صاحب کی تھی جو ایریل کے نام سے اس کے

ہفتہ وار میگزین میں بڑے شاندار اور شگفتہ مضامین لکھا کرتے ہیں، انھوں نے میرے متعلق "

Torch Bearer of Dying Tradition. "

کے عنوان سے بہت کچھ لکھا اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے معلوم نہیں اس کا مستحق ہوں بھی کہ نہیں، ڈان کے ارباب
میں قلم کے ایک اور ماہر کا نام بھی محمد علی صدیقی ہے، انھوں نے میرا ایک انٹرویو اسلام اور مستشرقین پر
لیا، اور اس میں اپنے قلم کی طاقت، روانی اور جادو طرازی دکھا کر اس کو بڑی نمایاں سرخی

"Challenge From The Orientalist"

کے ساتھ ڈان میں شائع کیا

ایک روز جسارت کے اڈیٹر جناب صلاح الدین صاحب نے فاران ہال میں پاکستان کے صحافیوں سے ملنے کا
موقع دیا، پھر اپنے گھر پر مدعو کر کے بعض مزید کالم نگاروں اور دانشوروں سے ملاقات کرائی، انہی کے اخبار میں "اسلام اور
مستشرقین" پر میرا ایک لمبا انٹرویو بھی شائع ہوا، ایک رات پاکستان کے مشہور صحافی جناب محمود شام صاحب نے
استاذی المحترم حضرت سید صاحب کا ایک انٹرویو لیا، اور نوائے وقت کے کئی کالموں میں اس کو بہت اچھے انداز میں شائع کیا،
ایک رات جناب نوبی والا نے اپنے سفرۂ کرم پر بلا کر اپنی محبت کی نکہت بیزی سے مشام جان کو معطر کیا، وہ پہلے آدم جی
مل کے بڑے اہم عہدیدار تھے، دار المصنفین اور معارف کے بڑے قدر داں ہیں، ان ہی کے یہاں جناب علی محمد صاحب سے بھی
نیاز حاصل ہوا جو پاکستان کے ٹکسٹائل کی صنعت اور مشروبات کو فروغ دینے میں بڑے کارنامے انجام دے رہے ہیں
انھوں نے اپنے بے پایاں الطاف و اکرام سے نواز کر اپنی علم نوازی اور دین داری کا ثبوت دیا، ان ہی سے مولانا
عبد الشکور فاضل دیوبند مسلک ہیں جو اپنے دینی اور علمی معلومات سے اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، جناب نوبی والا صاحب
کے یہاں نشست میں زیادہ تر مذہبی مسائل پر گفتگو رہی، وہ انگریزی میں برابر اچھے مضامین بھی لکھا کرتے ہیں،

استاذی المحترم حضرت سید صاحب کے خلیفہ ارشد مولانا غلام محمد صاحب اپنے سگے بھائی ہی کی طرح مل کر اپنے
اخلاص و محبت کا ثبوت دیتے رہے، اپنے یہاں مدعو کر کے بھی نوازا، انھوں نے اپنے ملنے والوں کے حلقہ میں بڑی دینداری

پیدا کر رکھی ہے، ناظم آباد کے جناب شمس الدین قالین والے نے کسی روز اپنے دولت کدہ پر بلایا، جہاں مولانا عبد القدوس
ہاشمی کے علمی معلومات کے جوئبار سے سیراب ہوتا رہا، وہیں جناب ضیاء الدین سابق ڈپٹی گورنر اسٹیٹ بینک پاکستان
سے ملاقات ہوئی جو بینک کاری کے سودی نظام پر دیر تک گفتگو کرتے رہے، ڈاکٹر عبد اللطیف کویت میں عرصہ دراز تک
رہ کر وہ معارف اور دار المصنفین کے بڑے قدر داں اور مربی ہیں، ایک رات ان کے یہاں ناظم آباد کے معززین یکجا تھے
بڑی اچھی علمی اور مذہبی گفتگوؤں کی صحبت رہی، اُن کے چھوٹے بھائی بھی ڈاکٹر ہیں اور بڑے اچھے عہدہ پر رہ چکے
ہیں ان کے یہاں بھی ان کے ہم پیشہ ڈاکٹروں کے ساتھ ایک رات اچھا وقت گذرا، جب محترم مولانا ناظم
ندوی کا گھر تو خانہ بے تکلف بنا رہا، وہ ہر طرح سے نوازتے رہے،

ایک روز فیڈرل بی ایریا میں حلقہ شاداب میں ایک اچھے مسلمان کی سیرت و کردار پر کچھ دیر تک بولنے کا موقع
ملا، اس کے ناظم جناب عبد الرحیم کی وجہ سے بڑی علمی اور مذہبی سرگرمیاں رہتی ہیں، یہاں تنظیم دعوت حق کے تحت درس قرآن
بھی ہر جمعہ کو ہوا کرتا ہے، اسی حلقہ میں ایک روز جناب ایم توحید صدیقی کے یہاں بھی مدعو ہوا، ایک روز سابق ہم وطنوں نے
سمندر کے کنارے ویلفیئر ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ کیا، وہاں مدعو کر کے اپنا خصوصی مہمان بنایا اور بچوں کو انعامات دلوائے
۱۹ فروری کو پورٹ ٹرسٹ کی ایک مسجد رحمت کی رسم افتتاح کر کے اپنی مغفرت کے لئے توشۂ آخرت حاصل
کیا، اس کے صدر ریئر وائس ایڈمیرل جناب ایم آئی ارشد ہیں، جو پورٹ ٹرسٹ کے علاقے میں اب تک پندرہ مسجدیں
بنوا چکے ہیں، ان کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں خاص لذت حاصل کرتے ہیں، وہ بڑے خدا ترس دیندار اور تہجد گذار ہیں
اپنی باتوں میں کلام پاک کی آیتوں کے حوالے دیتے رہتے ہیں، مسجد کی رسم افتتاح بہت ہی باوقار طریقہ پر انجام پائی،
اسی کے احاطہ میں ایک درخت نصب کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، اور وہاں کی بزم ادب کے ایک بہت ہی منتخب
مجمع میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے ایک تقریر بھی کرائی گئی، سوال و جواب سے یہ مجلس بڑی دلچسپ رہی،
پورٹ ٹرسٹ کے لوگوں نے اپنی میزبانی میں ہر طرح کی خوش سلیقگی دکھائی،

وطن کو واپس ہو رہا تھا تو جناب مولانا قاضی عبد الرحمن اپنے ادارہ الرابطۃ العالمیۃ الاسلامیہ ماری پور روڈ

لے گئے، جہاں اپنا دفتر اور مطبع دکھایا، صحیح بخاری کی جو اردو شرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کی تھی اس کو زیر طبع کررہے ہیں، یہ شاید دس جلدوں پر مشتمل ہو، دو جلدیں نذر کیں، جو بہت عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، ان کا یہ شاندار اور مفید کارنامہ ہر طرح کی مبارکباد اور تحسین کا مستحق ہے، ان شاء اللہ معارف میں ان پر تفصیلی ریویو ہوگا، انھوں نے ہر طرح کی خاطر داری اور تواضع سے اپنا گرویدہ بنالیا ہے،

اسلام اور مستشرقین پر جو سمینار دارالمصنفین میں فروری ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا اس میں طے پایا تھا کہ اس کی دوسری نشست قطر میں ۱۹۸۴ء میں ہو مگر اس کے بعد اس کی تیسری نشست پاکستان میں ہو جس کے داعی جناب حکیم محمد سعید تھے، قطر میں بعض اسباب کی بنا پر دوسری نشست نہ ہوسکی، جناب حکیم محمد سعید صاحب سے ان دو لکھنؤ پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے یہ منظور کرلیا کہ قطر میں نہ ہوسکی تو پاکستان میں ہوجائیگی، اس سلسلہ میں ایک دوسری نشست کراچی کے بڑے نامور اور لائق سرجن ڈاکٹر تقائی کے گھر پر ہوئی، اس کے بعد ۲۱ جنوری کو جناب فضال مبین کے گھر پر ہوئی نشست ہوئی جس میں کراچی کے بہت سے اکابر شریک ہوئے، اور طے پایا کہ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، بزم ہمایوں اور بزم نور کے زیر اہتمام یہ ۵، ۶، ۷ دسمبر ۱۹۸۴ء کو کراچی میں ہو، اس کے ضروری مسائل دارالمصنفین سے طے ہورہے ہیں اس سفر میں بکثرت کتابیں تحفے میں ملیں جن کا ذکر معارف کے کسی آیندہ اشاعت میں آئیگا، ان کو ہندوستان ڈاک سے بھجوانے میں جناب محمد طیب طاہر نے بڑی مدد کی، وہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے معتقد اور گرویدہ ہیں، انھوں نے گرین ٹاؤن میں بچوں اور بچیوں کو کلام پاک پڑھانے کے لئے مدرسہ سلیمانیہ قائم کیا ہے، ان کا ایثار کہ اپنے مکان کا نصف حصہ اس کے لئے دے رکھا ہے، اس کے لئے نئی زمین خریدنے کی فکر میں ہیں، حضرت سید صاحب کے ایک دوسرے معتقد جناب انیس الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ ہیں، انھوں نے اورنگی میں بہت بڑا رقبہ حاصل کرلیا ہے جس میں وہ ان کے نام پر ایک اسکول، ایک ڈگری کالج، ایک اکیڈمی، اور درس نظامیہ کا ایک مدرسہ کھولنے کا عزم رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے ارادے میں کامیاب کریں۔ آمین،

مقالات

بحث و تحقیق میں مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی

مترجمہ:- ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بحث و تحقیق میں علمی نہج و طریقہ اختیار کرنے سے یکساں نتائج برآمد ہوتے ہیں، البتہ کم ہی ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کرنے والے اپنے مطالعہ و تحقیق میں مثبت و منفی، مدح و قدح اور حق و باطل دونوں ہی رخوں اور پہلوؤں کو اختیار کرلیں، مگر اس کے برخلاف مستشرقین کی بحث و تحقیق میں عموماً شدید اختلاف و تعارض بلکہ کبھی کبھی تو سخت تناقض بھی ہوتا ہے۔

اگر واقعۃً ان کی تحقیقات علمی اور معروضی اصول و نہج پر مبنی ہوتیں تو ہرگز یہ اختلاف و تعارض نہ ہوتا، بعض مسلمان مصنفین نے اس تضاد و تعارض کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ محض مستشرقین کی جہالت و حیرانی ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں ان کے یہ اغراض بھی کارفرما ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جاہل ثابت کرنا اور ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔

مستشرقین کا یہ تعارض و تضاد کبھی تو خود اپنی ہی تحقیق کے خلاف ہوتا ہے جیسے وہ کبھی ایک

موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کوئی چیز ثابت کرتے ہیں، مگر دوسری جگہ اس کی نفی و تردید
کر دیتے ہیں یا کسی مبحث کے سلسلہ میں ایک موقع پر جو رائے ظاہر کرتے ہیں، اسی بحث میں
دوسرے موقع پر اس سے مختلف کوئی اور خیال پیش کر دیتے ہیں، مثلاً کبھی تو وہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت (ناخواندہ ہونا) ثابت کرتے ہیں اور کبھی اس کی نفی و تردید کر دیتے
ہیں، کبھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید وحی الٰہی ہے، پھر خود ہی اپنے اس خیال کو منہدم کر کے کہتے ہیں،
کہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن و دماغ کی اختراع ہے۔

مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کی دو نوعیتیں ہیں (۱) خود اپنی ہی رائے و
تحقیق سے انحراف و اختلاف (۲) دوسرے مستشرقین سے ان کا اختلاف۔

پہلی نوعیت | اس میں شبہ نہیں کہ ایک انصاف پسند محقق کے سامنے بھی کبھی مختلف نقطہ ہائے
نظر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں وہ علمی و منطقی اصولِ ترجیح سے کام لیکر کسی ایک نقطہ نظر کو
دوسرے پر ترجیح دیتا ہے، علمائے محققین کسی خاص روایت و حدیث یا ثبوت و سند کی بنا پر
پہلے کوئی رائے قائم کرتے ہیں، مگر جب اس سے زیادہ قوی اور مرجح کوئی صورت ان کے سامنے
آجاتی ہے تو وہ پہلی رائے کو ترک کر دیتے ہیں، اجتہادی امور و مسائل میں یہ طریقہ ہمارے علما کے یہاں
بہت معروف ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ بعض بعض علما سے ایک ہی مسئلہ میں متعدد آراء و اقوال منقول
ہوتے ہیں اور ہر ہر قول کی کوئی نہ کوئی دلیل و حجت ضرور ہوتی ہے، مگر آخر میں وہ زیادہ صحیح اور
مرجح قول کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مستشرقین کے یہاں جو تعارض اور تضاد پایا جاتا ہے،
اسے نہ بحث و تحقیق سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ معروضیت و معقولیت سے کوئی تعلق، یہ سب کے
سب یا اکثر اپنی پچھلی غلطیوں اور اوہام سے رجوع کرنے کے باوجود ان کی تلافی پر قادر نہیں ہوتے۔
جرمن مستشرق نولڈیکی کو مسلمان محققین اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں چنانچہ اسکی

کتاب تاریخ القرآن میں قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک حملے کئے گئے ہیں، یہ
دوسرے مستشرقین کا قابل اعتماد ماخذ ہے، حالانکہ یہ کتاب اس نے جوانی میں لکھی تھی، اس میں جن
غلطیوں کا وہ مرتکب ہوا ہے ان کے بارہ میں معذرت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"شباب کی بے پروائی اور غلطی کے اثرات اسی وقت محو ہو سکتے ہیں جب گذشتہ تحریر
کی نظر ثانی کی جائے یا نئے سرے سے ایسی کتابیں لکھی جائیں جو پرانی کتاب کے اثرات
زائل کر دیں، کیونکہ پہلے جن مسائل کو میں صحیح سمجھتا تھا، بعد کی تحقیق سے وہ غیر صحیح
ثابت ہوئے"[1]

سیرت نبوی کے علاوہ دوسرے موضوعات و مباحث قرآن، حدیث اور عقائد وغیرہ
میں بھی مستشرقین کے یہاں اس قدر تعارض اور تناقض ہے، جو حد شمار سے باہر ہے، اس کی
دو مثالیں ملاحظہ ہوں گولڈزیہر کی کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی کے صفحات ۱۲، ۳۰، ۳۱، ۳۲،
۴۷، ۴۸، ۵۹، ۱۵۵ اور ۹۶ پر خاص طور سے اس کی تحقیقی بے راہ روی نظر آتی ہے، اس کتاب کے
مترجم ڈاکٹر عبد الحلیم نجار نے اس کی نشاندہی کی ہے، اور ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی نے کتاب السنۃ
و مکانتہا میں مستشرقین کے ساتھ ان عرب علما و محققین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کو بھی نمایاں
کیا ہے، جو مستشرقین ہی کا انداز اور طریقہ بحث اختیار کئے ہوئے ہیں۔

خاص سیرت نبوی کے موضوع پر مارگولیتھ نے ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے نہایت
نادر و نامانوس اور عجیب و غریب باتیں بھی لکھی ہیں اور یہ کذب و باطل کا مجموعہ بھی ہے، اس کا
ایک نہایت مضحکہ خیز خیال یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مصر کا سفر کیا تھا، کیونکہ ان کے
بارہ میں آپ نے جو کچھ بیان دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو مصر کے بارے میں مکمل واقفیت تھی

---

[1] بحوالہ مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق جلد ۲۱ ص ۲۵۲۔

مگر یہی مصنف دوسرے مواقع پر تحریر کرتا ہے کہ آپ نے محض ملک شام کا سفر اپنے چچا کے ساتھ اپنی بیوی کا مال تجارت لیکر کیا تھا۔

فاضل مستشرق نولدکی اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ "محمدؐ کو یہ معلوم نہ تھا کہ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے، اگر انھوں نے وہاں کا واقعی سفر کیا ہوتا تو وہ اس بات کو ضرور جانتے کیونکہ یہ عام بات تو کسی بھی واقفیت رکھنے والے سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی[1]"

یہی مارگولیتھ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ونسب کے بارہ میں بھی شک وشبہ ظاہر کرتے ہیں اور ایک جگہ تو اسے ایک تاریخی معما قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ آپ علیؓ بن ابی طالب کے چچا کے لڑکے تھے۔

رینان کی رائے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تعصب وعناد پر مبنی ہے، یہ ایک موقع پر آپ کو دھوکہ، فریب اور مکر وغیرہ کا حامل قرار دیتے ہیں اور دوسرے موقع پر آپ کی سچائی اور مصالحت کا اعتراف کرتے ہیں، ان کی اسی تضاد بیانی کی وجہ سے ایک بڑے محقق بریکانیہ نے ان کے بارہ میں کہا ہے کہ "یہ شخص واقعات ومسائل کو توڑ مروڑ کر ان کی ہیئت اور صورت ہی کو الٹ پلٹ دیتا ہے، کیونکہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے اس کے اندر خاص کد و عداوت رچ بس گئی تھی"

دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ فرانسیسی استشراق اور مستشرقین کو بگاڑنے میں اس کی اسی قسم کی رایوں کا دخل ہے[2] گستاف لوبون نے بھی رینان کے خطبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تردید کی ہے اور اس کے تناقض کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کے عجز و درماندگی کو ثابت کرنا چاہتا ہے، اور دوسری طرف اس کے قریب ہی جو کچھ لکھتا ہے اس سے

---

[1] اسلام اور یورپ ص ۹۲ [2] اسلام اور عربی ثقافت ص ۱۶۶

اس کی تردید ہوتی ہے، کبھی وہ عرب مورخین پر ایک الزام عائد کرتا ہوا کبھی اسکی تردید کرتا ہے، مثلاً وہ عرب مورخین پر الزام عائد کرتا ہے کہ وہ تصنیف وتالیف، نقد وبحث اور تجزیہ وتحلیل میں عاجز وقاصر ہوتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ کتب سیر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی وثاقت وصحت کا اعتراف بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سیرت نبویؐ کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے۔

رباط یونیورسٹی کے استاذ فلسفہ ڈاکٹر حکمت ہاشم نے رینان کے آراء کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کی تردید کی ہے۔

کولونیل باڈلے نے محمدؐ کی لائف پر کتاب الرسول تصنیف کی ہے، دوسرے مشرقی موضوعات پر بھی اس کی کتابیں ہیں، سیرت پر اپنی کتاب کا یہ نام اس نے اس لیے رکھا ہے کہ قرآن میں آپؐ کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے کسی کو دھوکہ نہ ہو کہ وہ بھی اسلام پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے، جس طرح مسلمان رکھتے ہیں، کیونکہ اس کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام مذاہب کو یکساں سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ اذان اور دوسرے شعائر و مراسم ہی ایک دین سے دوسرے دین کے اختلاف کا باعث ہیں، البتہ وہ رسول اللہؐ کی فضیلت وعظمت کا معترف ہے، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے ان منکرین کی تردید میں نیک نیتی بھی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقد ہیں،

عقاد نے اس کتاب کی فکری گمراہی، بے راہ روی اور تضاد بیانی وغیرہ کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، حالانکہ اس کی چوتھی فصل میں وحی کے متعلق نہایت گمراہ کن اور اس قدر متضاد باتیں لکھی گئی ہیں، جن کی ابتدا و انتہا کا پتہ نہیں، اس میں آپؐ کے عقیدہ کے متعلق یہ شک وانحراف عائد کیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپؐ کی بیوی اور خود آپؐ بھی بت پرست تھے، اور

اللہ کے ساتھ اس کے شرکا کی پرستش کرتے تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ آپ نے نسطوری راہب اور دوسرے لوگوں کا اثر قبول کیا تھا، اور آپ پر ایک اعصابی کیفیت طاری ہوتی تھی جو آپ کے افکار پر اثر انداز ہوتی تھی مگر اس کے بعد وہ اس کی تردید بھی کرتا ہے کہ یہ مرگی اور اعصابی بیماری نہ تھی۔

وحی کے معاملہ میں اس نے اس تناقض و تردد کا اظہار کیا ہے کہ وہ مرگی یا ملیریا کا نتیجہ ہو یا روحانی سفر کا کیف ہو، وحی کی کیفیت سے لیکر سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول تک جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی قسم کا تردد و تذبذب پایا جاتا ہے، آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یا امی اور ناخواندہ تھے اس کی بحث میں بھی تردد، اشتباہ اور تعارض پایا جاتا ہے۔

دوسری قسم | اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن مستشرقین ہوں یا نرم پسند اور معتدل مستشرقین، دونوں گروہوں کی اکثر تحقیقات شکوک و شبہات اور کذب و افترا پر مشتمل ہوتی ہیں، باقی جو تحقیقات معقولیت و انصاف پسندی پر مبنی ہوتی ہیں، ان میں بھی کجی، بے راہ روی اور تعارض نمایاں ہوتا ہے۔

مستشرقین نے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ مستحکم اختلافات اور قوی اعتراضات کا باعث بنے ہوئے ہیں، مختلف پہلوؤں سے مثبت اور علمی اسلوب و نہج پر جن مسائل کی باقاعدہ تحقیق و تنقیح ہو چکی ہے، انھیں بھی غرض پسند مستشرق اپنی کجی اور گمراہی سے ڈھا دینا چاہتے ہیں۔

ان کی ایک جماعت ضعیف بنیادوں پر کسی گڈمڈ رائے یا مطعون قول پر متفق ہو جاتی ہے اور اسے صحیح باور کر کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اسکی نشر و اشاعت کرتی ہے، لیکن اصلی عربی ماخذ پر مبنی دوسری تحقیق اس کو دلیل و برہان سے غلط ثابت کر دیتی ہے۔

دراصل اختلاف رائے اور چیز ہے اور تحقیقی کجی، گمراہی اور بے راہ روی اور چیز ہے، اختلاف رائے کی صورت میں اس کا امکان ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کرنے والا کسی مرجح رائے یا یقینی نتیجہ تک پہنچ جائے اور شک و تردد کے بندھن سے آزاد ہو کر خود اپنے تئیں صحیح فکر اور متوقع نتیجہ کی تلاش و تفتیش کرے۔ لیکن تحقیقی گمراہی اور بے راہ روی میں نہ کوئی دلیل و سند ہوتی ہے اور نہ اس سے فہم سلیم کا پتہ چلتا ہے جو کسی طالب حقیقت انسان کے اندر ہوتی ہے، تعارض کی اصل و بنیاد ہو تو اس میں تطبیق کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً یہ ممکن ہے کہ بعض محدثین کسی وجہ سے ایک روایت کو ضعیف قرار دیتے ہوں اور دوسرے اسے صحیح مانتے ہوں کیونکہ ان کے نزدیک دلائل سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں گروہوں کے نزدیک نقد کے کچھ اصول اور قاعدے ہیں، ایسی صورت میں ظاہری تعارض کے رفع ہو جانے کا امکان ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسراء و معراج روحانی ہوئی تھی، مگر دوسرے محققین کا استنباط یہ ہے کہ معراج روحانی کے ساتھ جسمانی بھی تھی ثبوت میں دونوں نصوص و دلائل پیش کرتے ہیں ایسے موقع پر غالب گمان یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تعارض رفع ہو جائے۔

رہی تحقیقی بے راہ روی اور تضاد بیانی تو اس میں علمی ذمہ داری اور دیانتدارانہ بحث و تحقیق نہیں ہوتی اس لئے جدال و خصومت کی نوبت آجاتی ہے، جس کا نتیجہ کینہ و کدورت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اس میں نہ کوئی ممتاز حجت و دلیل ہوتی ہے جو دوسری حجت و دلیل پر غالب آجائے اور نہ روشن فکری موقف ہوتا ہے، جو دوسرے دقیق اور مبہم موقف کو واضح کر دے، بلکہ پراگندہ رائیں اور متضاد و مختلف اقوال ہوتے ہیں جو کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے۔

یہاں پہنچ کر بحث و تحقیق کرنے والے کے ذہن میں اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آخر دلیل کیا ہے؟ اس رائے کی علمی قدر و قیمت کیا ہے، اور اختلاف و نزاع کے موقع پر تطبیق کی کیا صورت ہوگی اور اس کے قریب و بعید، مقصود و غیر مقصود مدلولات کیا ہیں؟ مگر مستشرقین کے تعارض، تضاد اور بے راہ روی کے دائرہ میں یہ سب باتیں نہیں ہوتیں۔

یہاں ہم نے ایک پہلو کی وضاحت کی ہے، اس سے اختلاف رائے اور تحقیقی بے راہ روی و تضاد بیانی نیز معروضی و علمی مناقشہ اور جدال و تعصب پر مبنی مناقشہ کے فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مزید تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے اب مستشرقین کے باہمی تضاد اور بے راہ روی کی بعض صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔

اسلامی تاریخ کے بارہ میں بے راہ روی ایک مستشرق بکر اسلامی تاریخ اور اس کے مولفین کی نسبت لکھتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے بارہ میں عربوں کی کتابیں جھوٹ کا انبار اور غلطیوں سے پر ہیں، تاریخ کے مسائل اور واقعات کے زمانے کی ترتیب میں وہ خاص طور پر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں دوسرے مستشرق جین نے بھی یہ لکھکر اس کی تائید کی ہے کہ تاریخ میں مہارت و کمال کا ایشائی قوموں میں فقدان ہے کیونکہ وہ نقد و فلسفہ کے اصول و قوانین سے ناواقف ہیں تعصب، عداوت اور کینہ سے بھرے ہوئے ان جانبدارانہ اقوال کے مقابلہ میں سیدیلو اور براون کہتے ہیں کہ عربوں سے عمدہ اور بہتر تاریخ اب تک غیر عربوں نے نہیں لکھی[1]، کیلینو نے بھی تاریخ نگاری میں عربوں کی دقت نظر اور باریک بینی کی شہادت دی ہے وہ لکھتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کے مختلف اصول اور طریقے وضع کئے ان کا ایک طریقہ تو یہی ہے کہ وہ سال بسال سنین کا ذکر کرتے ہیں، دوسرے بقدر استطاعت سیاق کے اعتبار سے

[1] بحوالہ مجلۃ العلمی العربی دمشق ج ۱۱ ص ۶۶۹ ۱۹۳۱ء

حوادث و واقعات کی روایت کی جانب اعتناء کرتے ہیں[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے عوامل، آپ کی نفسیات، بعثت سے قبل کے میلانات اور علالت و وفات کے اسباب کے بارہ میں بھی اسی قسم کی بے سر و پا باتیں کہی گئی ہیں جنھیں ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔[2] ہم دو ہی باتوں کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

بعثت سے قبل کے میلانات ڈوزی کا بیان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مزاج سوداوی تھا، آپ برابر خاموش رہتے تھے، تنہا طویل سیر و سیاحت سے آپ کو رغبت تھی، مکہ کی وحشتناک گھاٹیوں کے اندر غور و فکر میں غرق رہتے تھے،[3] پادری لامانس نے تمام حقائق کو بالائے طاق رکھدیا ہے، وہ اس کی تردید میں لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوت گزیں اور معتکف ہونے کا کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا ہے[4]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور موت کے اسباب لامانس نے اپنی اسلام دشمنی کے جذبات کو تسکین دینے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اسے معقولیت، حقیقت اور تاریخ سے کوئی تعلق نہیں وہ کہتا ہے "محمد کی شہوانیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، ان کا جسم مرغوب اور لذیذ غذاؤں کی وجہ سے موٹا ہو گیا تھا، اعضاء بے حس و حرکت ہو گئے تھے، اور سکتہ کی بیماری کی وجہ سے آپ خوفناک اور ڈراونے معلوم ہوتے تھے"۔

اس کے بالکل ہی برخلاف دوسرا مستشرق مینیہ سفلہ لکھتا ہے کہ بعض دفعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جسم پر بھوک کی وجہ سے شدید ضعف کے اثرات نمایاں رہتے تھے، لگاتار دو روز تک ہذیانی بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے آپ کی وفات ہوئی۔

تیسرے مستشرق کلیمان ہیار نے ان دونوں کی تردید کی ہے ان کا بیان ہے کہ محمد کے پیچھے

[1] اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۴۳ [2] یورپ اور اسلام ص ۸۰ تا ۹۳ [3] اندلس کے مسلمان ص ۱ تا ۱۸
[4] ملاحظہ ہو اس کی کتاب "کیا محمدؐ سچے تھے"، ج ۱ ص ۱۔

میں سوزش اور جلن کے عوارض ظاہر ہوئے، اس بنا پر آپؐ کے قویٰ نہایت تیزی سے کمزور ہو گئے[2]
... پادری باردو کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک یہودی عورت نے زہر کھلا دیا تھا اسکی وجہ سے آپ کی وفات ہو گئی۔[3]

ڈاکٹر عبدالحلیم ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اوپر جو کچھ گذرا ہے اسے ملاحظہ کرنے کے بعد کیا ہم مستشرقین کے آراء پر اعتماد کر سکتے ہیں، حالانکہ ہم نے ان کے بیشمار اختلافات میں سے نہایت تھوڑے اختلافات ہی بیان کئے ہیں، ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود ایک مستشرق ہی دوسرے مستشرق کی بنیاد ڈھاتا اور اس کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔"

سیرت نبویؐ سے متعلق بعض مسائل میں مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی

لفظ محمد اور محمدیت کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، بوڈلے[4] لکھتا ہے کہ لفظ محمد (Nammet) اصنام کے معنی میں مستعمل ہے اور اسی سے کلمہ (Mahomerie) مشتق ہے اور کلمہ (Mumety) مصدر کے طور پر مجون کے لئے اور بتوں کی پرستش کے لئے محمدیت (Mametry) آتا ہے، جون سلدن نے اس بیان پر نقد و تعقب کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس تعریف و تشریح کے نتیجہ میں محمد اور محمدیت مبغوض اور ناپسندیدہ نام ہو گئے ہیں جب کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ ترک یعنی مسلمانوں کے دین میں بتوں کی پرستش حرام ہے، بوڈلے نے محمدیت کی جو تعریف کی ہے اسکی تردید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے اتباع نے اپنے قائد کا مکمل احترام و توقیر کرنے کے باوجود کبھی محمدی یا محمدیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہو بلکہ وہ اس نام سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کی اساس و بنیاد رکھی اسکو اختیار کرنے والوں کی تعبیر ہمیشہ لفظ مسلم سے کی جاتی ہے جس کے معنی اپنے آپ کو مشیت الٰہی کے حوالہ کرنے والے کے ہیں پھر وہ آپ کے زہد کا تذکرہ کرتا ہے اور آپ کے دوسرے بشری اوصاف و کمالات نیز آپ کی قائدانہ اور پیغمبرانہ خصوصیات کو گناتا ہوا اور آخر میں آپ کی زندگی میں ہونے والی آپ کی کامیابی کو بیان کر کے کہتا ہے کہ یہ غیر ذمہ دارانہ بیانات آپ کی شان سے کس قدر بعید ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب تاریخ العرب ج ۲ ص ۱۸۱، [2] علامات محمد ماہی و ما فیہا ص ۱۱۱، [3] ایضاً ص ۱۱، [4] ایضاً ص ۱۸

اسلام میں تصور ریاست

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"کراچی میں ہمدرد سیرت کانفرنس کے تحت مذاکرہ علمی تعلیمات نبویؐ میں تصور ریاست اسلامی پر ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۳ء کے پہلے اجلاس میں خاکسار نے جو اپنا صدارتی خطبہ پڑھا، اس کی نقل ذیل میں درج ہے۔" "ص۔ع"

حضرات!

میں آپ لوگوں اور خصوصاً اس مذاکرہ کے منتظمین کا شکر گذار ہوں کہ اس مقام سے اپنے کچھ خیالات کے اظہار کرنے کا موقع دیا، ایک ماہر سیاست داں کی حیثیت سے تو نہیں بلکہ تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے عرصۂ دراز سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ قرآن پاک اور احادیث مبارک میں اسلامی حکومت کی نوعیت کیا متعین کی گئی ہے، اور اس میں حکمرانی کے اصول کیا بتائے گئے ہیں، اور گذشتہ چودہ سو سال کے اندر اس کی عملی صورت کیا رہی ہے، اپنی حقیر کتابوں اور ناچیز تحریروں میں اپنے خیالات کو پیش کرتا رہتا ہوں، آج مختصر طریقہ پر ان کا اعادہ کرنے کی اجازت آپ سے چاہتا ہوں، آپ اس لحاظ سے بھی سماعت فرمائیں کہ ایک غیر اسلامی ملک کا رہنے والا مسلمان اسلامی ریاست کا کیا تصور رکھتا ہے،

اپنے ناچیز مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ قرآن میں اسلامی حکومت کی نوعیت متعین

نہیں کی گئی ہے، ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی واضح ہدایت نہیں دی ہے کہ حکومت کی نوعیت کیا ہو، اس کے سربراہ کا انتخاب کیسے ہو، اور اس کو غیر واضح رکھنا مصلحت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، تاکہ لوگ زمانے کے تقاضے، اپنے سیاسی مصالح، جغرافیائی حالات اور معاشرتی ضروریات کی بنا پر جیسی حکومت چاہیں، قائم کرتے رہیں، البتہ قرآن پاک اور حدیث میں حکمرانی کے اصول واضح طور پر بیان کیے گیے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں،

پھر فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)

مومنو! جتنی امتیں (قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں، تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو، اور خدا پر ایمان رکھتے ہو،

یعنی مسلمان ایک امت کی حیثیت سے اعلیٰ اور اشرف ہوں، دنیا کی قوموں کے درمیان صدر ہوں، وہ بہترین گروہ بن کر انسان کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں اتریں، اور نیکی کا حکم دیں، اور بدی کو روکیں،

اور اگر ان کی حکومت قائم ہو تو وہ تسلیم کریں کہ ملک اور حکومت کا اصلی مالک خداوند تعالیٰ ہے، وہی حکومت دیتا ہے اور وہی چھین بھی لیتا ہے، وہی زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے،

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (مائدہ: ۱۸)

آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب پر خدا ہی کی حکومت ہے اور سب کو اسی کی طرف (لوٹ کر جانا ہے)

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ (انعام: ۱۶۵)

اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا، اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے، تاکہ اس نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے،

اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا احساس دلانے کا مقصد یہ ہے کہ حکومت پانے والوں کے دلوں میں کسی کا ڈر ہے، اور جب وہ ساری کائنات کا مالک ہے، تو اسی کے احکام کی بالادستی ہوگی، اس کا حکم ہے کہ زمین کی حکومت کے وارث نیک بندے اور عبادت گذار ہوں گے،

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ٥ (انبیاء: ۱۰۵)

میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے،

اس وراثت میں نیک بندے اور عبادت گذار کا انتخاب کیسے ہو؟ اس کی وضاحت کلام مجید میں نہیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے، امرھم شوریٰ بینھم کی تلقین ضرور ہے، مگر یہ سیاست کے سلسلہ کی نہیں، بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے ہے، اس کا اطلاق سیاست پر بھی ہو سکتا ہے، یعنی باہمی مشورے سے حکومت کے لیے نیک اور عبادت گذار بندوں کا انتخاب ہو، مگر اس کی وضاحت نہیں کہ پہلے سربراہ حکومت کا انتخاب ہو جو مجلس شوریٰ کی تشکیل کرے، یا پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو جو سربراہ حکومت منتخب کرے، یہ بھی لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، اگر پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو تو اس کا انتخاب کون کرے گا، مجلس شوریٰ حکومت چلانے کے لیے ہوگی، اس لیے

اس کے افراد کو قرآن کے حکم کے مطابق صالح اور عبادت گذار ہونا چاہیئے، جس کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ صاحب تدبر، صاحب فہم، صاحب بصیرت اور صاحب ادراک بھی ہوں، ان کے انتخاب کے لیے تو یہ اصول ہونا چاہیے، کہ ان کے انتخاب کرنے والے بھی صالح، عبادت گذار، صاحب فہم اصحاب ادراک اور صاحب بصیرت ہوں، اس طرح یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بالغ کو اس کے انتخاب میں شمولیت کا حق ہے، پھر بھی مجلس شوریٰ حکومت کے سربراہ کا انتخاب کر سکتی ہے، جس کے لیے قرآن مجید کی یہ شرط بھی ہے کہ وہ دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے، حالت خوف کو امن سے بدل دے، اللہ کی بندگی کرے اور کسی کو شریک نہ جانے، پھر وہ اللہ کے احکام کے مطابق انصاف کے ساتھ حکومت کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، چوروں، زانیوں اور شرابیوں کو خاص خاص قسم کی سزا دے، تاکہ معاشرہ ان برائیوں سے پاک رہے، وہ معروف کی ترویج اور منکر کا استیصال کرے، دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتے، کیونکہ خدا چاہتا تو ساری دنیا کو ایک عقیدہ کا بنا دیتا، ان شرایط کی پابندی جو بھی کرے، وہ حکومت کا سربراہ ہو سکتا ہے، پھر اس کے لیے حکمرانی کے اصول بھی متعین کیے گیے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ جو زمین پھیلائی گئی ہے، اور جو پہاڑ جمائے گیے ہیں، اور جو نباتات اگائے گیے ہیں، اس سے معیشت کے اسباب فراہم کیے جائیں، اور یہ معیشت سب کے لیے ہو، اس طرح معیشت سنوارنے میں ویلفیر اسٹیٹ کا تخیل پیش کیا گیا ہے، نجی جائداد کی ممانعت نہیں کی گئی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ باطل طریقہ سے حاصل نہ کی جائے، ظلم اور زیادتی سے دولت جمع کرنے والوں کو آگ میں جھونک دینے کی دھمکی دی گئی ہے، نجی جائداد کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی رہے، ورنہ یہ ناجائز ہے، یہ تقسیم سرمایہ داری کے انسداد کے لیے ہے، اس روک کی خاطر یہ بھی حکم الٰہی ہے کہ جو مال جمع کیا جائے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ پر خرچ کیا جائے، تاکہ یہ مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے، اسی لیے زکوٰۃ کو لازمی قرار دیا گیا ہے، صدقات کرنے کی بھی تلقین ہے، جو فقیروں اور مسکینوں کے علاوہ قرضداروں کی مدد کے لیے بھی ہیں، جنگ و صلح کے بھی باضابطہ احکام ہیں، ان لوگوں سے دوستی نہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جنہوں نے مسلمانوں سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، یا ان کو گھروں سے نکال دیا، یا ان کے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی، ایسے ظالموں سے جنگ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، مگر اس کی بھی ہدایت ہے کہ جنگ کرنے میں بے اعتدالی نہ ہو، پھر یہ بھی حکم ہے کہ جب دشمن صلح کی طرف مائل ہوں، تو ان سے صلح کر لی جائے، لیکن وہ فریب اور دغابازی سے صلح کی خلاف ورزی کریں، تو ان کی ایسی خبر لی جائے کہ دوسروں کے حواس باختہ ہو جائیں، قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کی گئی ہے، حکمرانی کے یہ وہ اصول ہیں جن پر یو۔ان۔او (U-N-O) بھی عمل کر کے دنیا اور انسانیت کو سنوار سکتی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں انہی احکام کی پابندی کی، آپ نے فرمایا ہے کہ تمہارے حاکموں میں سے بہترین حاکم وہ ہیں، جن سے تم محبت کرو، اور وہ تم سے محبت کریں، اور جن کے لیے تم دعا کرو، اور وہ تمہارے لیے دعا کریں، اور بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو، اور وہ تم سے بغض رکھیں، اور لعنت کرو تم ان پر، اور وہ لعنت کریں تم پر، آپ نے رحمۃ للعالمین بن کر اپنی زندگی میں سچائی، عفت، پاکبازی، دیانت داری، رحم، عدل و انصاف، عہد کی پابندی، عفو و درگذر، حلم و بردباری، تواضع و خاکساری، اعتدال، میانہ روی، سخاوت، حق گوئی، ایثار اور استغنا وغیرہ کے جو نمونے پیش کیے، وہی آپ کی حکمرانی کے بھی اصول بنے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے انتخاب کی کوئی خاص ہدایت نہیں دی، شاید اس لیے کہ لوگ اپنی خواہش کے مطابق اس کا انتخاب کریں، اسی لیے خلفائے راشدین کے انتخاب میں یکسانیت نہیں رہی، حالات کے تقاضے کے مطابق انتخاب کا اصول بدلتا رہا، اس سے ظاہر ہے کہ

کوئی حکومت چاہے تو اپنے سربراہ حکومت کے انتخاب کے موقع پر حالات اور ماحول کے تقاضے کے مطابق طرز انتخاب کو بدل سکتی ہے،

قرآن پاک اور حدیث مقدس کے ذریعہ ہم حکومت کی نوعیت تو متعین نہیں کر سکتے ہیں، مگر خلفائے راشدین کی حکومت کا مطالعہ کرکے ہم اسلامی حکومت کا تصور قائم کر سکتے ہیں، کیا یہ جمہوری طرز کی حکومت تھی؟ اس سوال کا جواب نفی میں دیا جا سکتا ہے، کیونکہ جمہوریت میں جمہور کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کی جاتی ہے، مگر خلفائے راشدین جمہور کے بنائے ہوئے قوانین کے بجائے قرآن مجید اور حدیث کے احکام کے پابند رہے، اور کتاب وسنت ہی کی بالادستی رہی، اس لیے کہ کلام پاک میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی پر اصرار ہے، غیر مسلم کہتے ہیں کہ یہ تھیوکریسی (Theo cracy) تھی، مگر یہ تھیوکریسی بھی نہ تھی، کیونکہ تھیوکریسی میں چرچ کی طرف سے حکومت ہوتی ہے، اسلام میں کوئی چرچ نہیں، ایک خیال ہے کہ یہ حکومت تھیوڈیموکریسی (Theo Democracy) تھی، مگر یہ تھیوڈیموکریسی بھی نہیں کہلا سکتی ہے کیونکہ تھیوڈیموکریسی میں کوئی سربراہ حکومت زندگی بھر کے لیے منتخب نہیں ہوتا، خلفائے راشدین میں ہر خلیفہ کا انتخاب زندگی بھر کے لیے ہوتا رہا، اس طرح یہ بادشاہت کی بھی ایک قسم تھی، وہ معزول نہیں کیے جا سکتے تھے، اس طرح رائے عامہ سے بے نیاز بھی رہ سکتے تھے، امت کے مشوروں کو ماننے پر قطعاً مجبور نہ تھے، بلکہ ان کی اطاعت امت پر واجب تھی، اس طرح وہ ڈکٹیٹر یعنی آمر بھی تھے، مگر وہ لوگوں کے مفاد اور فلاح کے خواہاں اور کوشاں رہے، ان کی بہبود کو اپنی حکمرانی کا اصل مقصد سمجھتے رہے، اس لیے بعض لوگوں کے خیال میں ان کی حکومت اسلامی سوشلزم کے طرز کی تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ جمہوریت، تھیوکریسی، بادشاہت، آمریت اور سوشلزم کی تمام خوبیوں سے معمور رہی، اور ان کی تمام برائیوں سے پاک تھی، اس لیے یہ بہترین حکومت قرار دی گئی،

اور یہ حکومت بہترین اس لیے بھی ہوئی کہ اس دور میں حکومت کی ظاہری شکل، یعنی انتخاب کے طریقے، ارباب شوریٰ کی ترتیب، ان کے فرائض وحقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دوسرے متعلقہ مسائل، اہمیت کے قابل نہیں سمجھے گئے، اصل چیز حکومت کے سربراہ اور ان کے عمال کا تقویٰ تھا، یعنی قرآن اور سنت کے احکام کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی اور ایمانی احساس تھا، جس کی کارفرمائی اور بالادستی کی وجہ سے پوری اسٹیٹ ایک ویلفیر اسٹیٹ بنی رہی،

مگر خلفائے راشدین کے بعد ایسی حکومت پھر قائم نہ ہو سکی، شام اور اندلس کے بنو امیہ، بغداد کے بنو عباس، مصر کے فاطمی، تاتاری خاندان کے اسلام کے فدائی حکمراں، اور جنگ صلیبی کے ہیرو، یعنی ایوبی فرمانروا، سلجوقیوں، دولت عثمانیہ، غزنویوں، غوریوں، سلاطین دہلی اور ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں وغیرہ نے خاندانی حکومتیں قائم کیں، کیوں؟ ایک رائے تو یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن پاک اور حدیث مقدس میں حکومت کی نوعیت متعین نہ تھی، اور جمہوریت کا ذکر نہیں تھا، اس لیے خاندانی حکومت قائم ہوتی گئی اور چلتی رہی، مگر ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ خلفائے راشدین نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو اپنا جانشین نہیں بنایا، اس لیے خاندانی حکومت کی بادشاہت اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہے، مگر اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جمہوریت کے بجائے بادشاہت کا ذکر تو بار بار آیا، خود اللہ تعالیٰ نے طالوت کو اسرائیلیوں کا بادشاہ مقرر کیا، اسی کے حکم سے حضرت داؤدؑ یہودیوں کے بادشاہ بنے، اور اسی کے حکم سے حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے، یہ تو خاندانی وراثت ہی تھی، انبیاء میں بھی نبوت خاندانی وراثت بنی رہی، حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ یکے بعد دیگرے نبی ہوتے رہے، اس لیے بادشاہت یا خاندانی وراثت کی کوئی کراہت کی

چیز نہیں کہی جا سکتی، مگر ایک مورخ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اسرائیلیوں کی بادشاہت ربانی بادشاہت
تھی، اور انبیاء کی خاندانی نبوت عطیۂ الٰہی تھی، اس لیے اس کی مثال، اسلام کی حکومت کے سلسلہ
میں نہیں دی جا سکتی ہے،

تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جتنی حکومتیں قائم ہوئیں، کیا وہ غیر اسلامی
تھیں؟ اگر ہم ان کو غیر اسلامی قرار دیں تو ہماری سیاسی تاریخ کیا رہ جاتی ہے، وہ تو ہماری تاریخ
کا جز بن چکی ہیں، ان کو اپنے سیاسی جسم کا بدگوشت قرار نہیں دے سکتے انہی سے ہمارے تمدن
اور روشن کارنامے وابستہ ہیں، اور ان ہی سے اسلام کی آن بان اور شان میں اضافہ ہوتا رہا، اور
اگر یہ غیر اسلامی تھیں، تو ہمارے علماء نے دعوت عزیمت اور مسلمانوں نے بغاوت اور جہاد سے
اس کو ختم کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ وہ کیوں خاندانی حکومت کو برداشت کرتے رہے؟ اس کی
وجہ جہاں یہ بتائی جا سکتی ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں نے ان کی مرضی کے خلاف ان کو اپنا اطاعت
گذار بنا لیا، وہاں یہ بھی وجہ بتائی جا سکتی ہے کہ جس حکومت سے امت مطمئن رہی، اس کو گوارا کرتی
رہی، خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی ہو، یہی اس کے پولیٹکل کلچر کا تقاضا رہا، امت کا پولیٹکل کلچر
اصل تو یہ ہے کہ ہر جگہ خلافت راشدہ کی ایسی حکومت ہو، مگر جب ایسی نہ ہو سکی، تو جس حکومت نے
شریعت کی بالادستی قبول کر لی گو یہ زبانی اور کاغذی ہی سہی، مگر ایسی حکومت سے امت کی
مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت کی پاسبانی، نگہبانی اور پشتیبانی کی ضمانت ملتی رہی، تو امت اسی
کو اپنا پولیٹکل کلچر بنا کر حکومت کی معاون ہو گئی، پھر اس کو اس کی فکر نہ رہی کہ حکومت کا سربراہ
کیسا ہے، اور اس کا طرز حکومت کیا ہے، امت کی یہ خاموش معاونت خاندانی حکمرانوں کی حکومت
کی اصل ضمانت تھی اور عوام کی یہ بیعت سمجھی جاتی، جس کے بعد حکمراں اپنی حکمرانی کو قرآن اور
سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے مجبور ہو جاتے، اور وہ کم از کم ظاہری طور پر دین کا نمائندہ

بن کر حکومت کو نا پسند کرتے، وہ لقب اختیار کرتے وقت قاہر باللہ، معتصم باللہ، مستنصر باللہ
یا قطب الدین، شمس الدین، محی الدین وغیرہ اختیار کرتے، اور آج کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا
کہ خاندانی حکومت کے زمانے میں کتاب و سنت کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، شیخ الاسلام، صدر الصدور،
قاضی، قاضی القضاۃ، مفتی اور محتسب وغیرہ جیسے اور عہدے تو اسی لیے تھے کہ وہ امت سے
اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی کراتے رہیں اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سارے ادارے
اسلام کی خاطر نہیں بلکہ اقتدار کے تحفظ کے لئے قائم ہوتے رہے، تو اسی طرح کی بدگمانی ہر اسلامی
تحریک سے کی جا سکتی ہے، کہ وہ اسلام کی خاطر نہیں بلکہ ذاتی قیادت اور مفاد کی خاطر
چلائی گئی،

میری یہ تحریر خاندانی حکومت کی مدافعت کے لیے نہیں، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ امت
کا ایک پولیٹکل کلچر تھا، اگر اس کو اطمینان رہا کہ کسی حکومت میں قرآن اور سنت کی بالادستی قائم
ہے، اور اس کی ملی حمیت اور ایمانی غیرت کی نگہبانی ہو رہی ہے تو اس سے وہ مطمئن رہ کر اس کا
ساتھ دیتی رہی، اسی لیے خاندانی حکومتیں قائم رہیں، اس کا پولیٹکل کلچر یہ بھی تھا کہ اگر وہ کسی حکمراں
سے بدظن ہو جاتی، تو وہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتی، بعض اوقات اس کے خاندان کے
حکمرانوں کی قبریں بھی کھود دیتی اور دوسری حکومت قائم کرنے میں معاون ہو جاتی،

اب بھی امت اپنے پولیٹکل کلچر کی بنا پر یہ چاہتی ہے کہ خلافت راشدہ کی طرح حکومت کا
قائم ہونا ممکن نہیں، تو اسلامی حکومت ضرور قائم کی جائے، جس میں قرآن اور سنت کی بالادستی ہو
وہ غیر شعوری طور پر مغربی طرز کی جمہوریت سے بیزار ہو چکی ہے، اس لیے کہ اس میں میکاوزم کے
پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کبھی اس کے سربراہوں کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہوتی
ہے، کبھی کہا کچھ جاتا ہے، اور کیا کچھ اور جاتا ہے، کبھی جمہوریت اصل چیز قرار دی جاتی ہے جمہو

بالکل نظرانداز کر دیے جاتے ہیں، جمہور زبان پر ہوتے ہیں دل میں نہیں ہوتے، جمہور سے
زیادہ ان کا ووٹ عزیز ہوتا ہے، ووٹ حاصل کر کے کوئی فاسق اور فاجر منتخب ہو جاتا ہے
تو وہ مقدس اور اعلیٰ سیرت و کردار کا مالک اس لیے قرار دیا جاتا ہے، کہ اس کو زیادہ سے
زیادہ ووٹ ملے ہیں، جمہوریت میں نیشن اسٹیٹ قائم کی جاتی ہے، جس کے بعد دو مختلف
نیشن میں جو خونریزی ہوتی ہے، اس کا نام نیشنلزم رکھا جاتا ہے، نیشنلزم کے نام پر ہر قسم
کا استحصال کیا جاتا ہے، جمہوریت میں دین اور دنیا کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بند رکھا جاتا
ہے، خدا کا حکم الگ ٹھہرایا جاتا ہے، اور قیصر کا حکم الگ۔

یہ ساری چیزیں اسلامی حکومت کے لیے منافی ہیں، اسلامی حکومت میں ہر وہ چیز رد
کیے جانے کے لائق ہے جو قرآن اور سنت کے احکام کے خلاف ہے، اصل چیز ان احکام کی عملداری
ہے، امت کسی زمانہ میں محد بدعتی، اباحتی، فاسق اور فاجر بن جائے یا علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں بٹ
کر تفرقہ پسند ہو جائے، تو اگر کوئی آمر حضرت عمرؓ کی طرح ہاتھ میں درے لے کر ان کو اللہ
اور رسول کا پابند بنائے، تو اسلامی حکومت میں اس کی آمریت جائز اور قابل قبول ہے اور
اگر کوئی سربراہ حکومت جمہور کے ووٹ سے صاحب اقتدار و اختیار ہو جائے، لیکن دین کا
پابند اور اس کی عزت و ناموس کا نگہبان اور محافظ نہ بن سکے تو وہ اسلامی حکومت کا سربراہ
نہیں کہلا سکتا، اگر منتخب اراکین کی قومی مجلس کا ایوان نہایت عالیشان اور سر بفلک ہو، لیکن
ان اراکین میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا ایمانی اور ملی احساس نہ ہو، تو یہ عالیشان
ایوان اسلامی مملکت کا ایوان نہ ہوگا، اگر سکریٹریٹ کی عمارتیں دیدہ زیب ہوں لیکن اس کے
اندر کے ملازمین میں خوف الٰہی کی وجہ سے فرائض کی بجا آوری کا جذبہ نہ ہو، تو یہ اسلامی
مملکت کا سکریٹریٹ نہیں کہلائے گا، اگر عدالت میں اسلامی قوانین کے ماتحت جھگڑوں

قضیوں کا فیصلہ نہ ہوتا ہو تو یہ اسلامی حکومت کی عدالت نہ کہلائے گی، اگر ملک کا اقتصادی،
زراعتی، مالیاتی، فوجی اور جنگی نظام قرآن اور سنت کے مطابق نہیں، تو یہ اسلامی مملکت کا نظام
نہیں کہلا سکتا، اگر کسی اسلامی ملک کے پر رونق شہر کی سڑکوں پر مسلمان اپنی وضع قطع اور لباس
میں مسلمانانہ نظر آئیں، تو وہ اسلامی مملکت کے شہری نہیں کہلا سکتے، اگر کسی اسلامی ملک کے
معاشرہ میں وہی ساری چیزیں نظر آئیں جو فاسقانہ، فاجرانہ یا ملحدانہ نظام مملکت میں نظر آتی
ہوں تو وہ اسلامی معاشرہ نہیں کہلایا جا سکتا ہے،

ہماری ملی غیرت اور ایمانی حرارت کے لیے یہ المناک چیز ہے کہ چودہ سو (۱۴۰۰) برس کے
بعد بھی ہم اسلامی مملکت کے تصور کی تلاش میں ہیں، یہ اس لیے کہ ہم ذہنی طور پر گرین، لاک
ہابس وغیرہ کے سیاسی افکار اور موجودہ دور کے جمہوری نظام کی جادوگری سے کچھ ایسے متاثر
ہو گئے ہیں، کہ ہم لذت کردار اور افکار عمیق سے محروم ہو کر قرآن و سنت کے احکام پر عمل کرنے
کے بجائے ان کو بدل دینے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں، یہ محض اس لیے کہ خود مسلمان سے مسلمان
کا مقام پوشیدہ ہے، اسلام کا محاسبہ یورپ کے ذریعہ سے کر رہے ہیں، اگر مسلمان خودنگر، خودگر
اور خودگیر ہو جائیں، تو کتاب و سنت میں ان کو ہر زہر کا تریاق مل جائے، فرنگی نے مسلمانی
خرید لی ہے، اس لیے مسلمان مقام ظل سبحانی سے محروم ہو گئے ہیں، اگر مسلمانوں کا دل
اب بھی خبیر و بصیر ہو جائے، تو ان کو قرآن اور سنت میں وہ ساری چیزیں مل سکتی ہیں،
جن سے وہ سیاست افرنگ کو شکست دے سکتے ہیں، اور بعض مسائل حاضرہ کو حل کرنے
کے لیے قیاس، اجماع اور اجتہاد کو بروئے کار لائیں، تو ان کے سجدوں میں ملت کی زندگی
کا پیام مل سکتا ہے،

آخر میں آپ حضرات کی توجہ اس طرف بھی دلانی ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی

طرف پندرہویں صدی کا ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا تھا، جس میں ایک سکشن اسلامی فقہ پر بھی تھا، اس مذاکرہ میں ہندوستان کے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس سوامی آیر بھی تھے، ان سے ان کے خیالات کے اظہار کرنے کو کہا گیا، تو وہ اسٹیج پر آئے، اور صرف یہ کہکر بیٹھ گیے

"جہاں تک میرا مطالعہ ہے، میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی قوانین ہی صرف ایسے قوانین ہیں، جو بین الاقوامی قوانین بنائے جاسکتے ہیں۔"

ایک غیر مسلم تو یہ کہے، اور اسلامی ممالک کے مسلمان اسلامی مملکت کے قوانین بنانے میں اپنے کو قاصر تصور کریں؟

آخر میں یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اسلامی ریاست کے تصور میں اب مذاکرہ کی خطابت، سمپوزیم کی وکالت، سیمینار کی موشگافی اور کانفرنس کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہیے بلکہ پاکستان کی تحریک کے سلسلہ میں شہروں کی جو غارت گری اور بستیوں کی جو بربادی ہوئی ہے اس کا معاوضہ چاہیے۔ پاکستان کی تحریک میں بکثرت شہید ہونے والوں کے خون کا خون بہا چاہیے، ان کی بیواؤں کے نالوں اور ان کے یتیموں کی سسکیوں کا صلہ چاہیے، کس طرح، پاکستان ایک مثالی، اسلامی اور فلاحی ریاست کی شکل میں ہوسکتا ہے شکریہ۔

علی فواد باشگل

از

جناب ثروت صولت صاحب، شمالی ناظم آباد، کراچی

"یہ مضمون، مضمون نگار کی ایک زیر طبع کتاب "ترکی اور ترک" کا ایک باب ہے ناظرین کی دلچسپی کے لیے شایع کیا جاتا ہے۔" "م"

علی فواد باشگل (Bashgil) جدید ترکی کے ایک ممتاز قانون دان، ماہر تعلیم اور سیاست دان تھے، ان کا شمار ان جرأت مند دانشوروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ترکی میں ایک پارٹی کی آمرانہ حکومت کو ختم کرنے اور جمہوریت کی بحالی اور آزادی فکر کے اصول کو منوانے کے لیے کامیاب جد وجہد کی، انھوں نے سیکولرازم کی ایک ایسی تعریف کی جس سے دینی حلقے مطمئن ہوگیے، اور ترکی میں دینی تعلیم کے فروغ میں تو شاید ان کا سب سے بڑا ہاتھ ہے،

علی فواد باشگل شمالی ترکی کے قصبہ چارشنبہ میں پیدا ہوئے، جو صوبہ صامسون میں واقع ہے، ان کا سال پیدائش عام طور پر ۱۸۹۳ء لکھا جاتا ہے، لیکن شکر داد غلو نے ۱۳۰۹ھ لکھا ہے، جو ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء سے مطابقت رکھتا ہے[1]۔ ان کے والد کا نام محمد شکر و بھادر، دادا کا نام حافظ ابراہیم، ابتدائی تعلیم قصبہ چارشنبہ میں پائی، پھر استنبول چلے گیے،

---

[1] علی فواد باشگل: ۱۹۶۰ کا انقلاب اور اس کے اسباب (ترکی ترجمہ از شکر داد غلو)

جہاں مزید تعلیم حاصل کی، جنگ عظیم اول چھڑنے پر وہ ۱۹۱۴ء میں تفقاز کے محاذ پر بھیجے گئے، جہاں انھوں نے چار سال تک محفوظ فوج کے افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، ۱۹۲۰ء میں علی فواد باشگل اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس چلے گئے، ۱۹۲۱ء میں انھوں نے پیرس کے بوفون کالج (Buffone) میں تعلیم مکمل کی، اس کے بعد گرینوبل یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لیا، یہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد وہ پھر پیرس آگئے، اور سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اور باسفورس اور دردانیال کے مسئلہ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، اس کے بعد فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ترکی واپس آگئے، یورپ میں قیام کے دوران انھوں نے پیرس میں سیاسی علوم کے مدرسہ سے بھی سند حاصل کی، اور ہیگ (ہالینڈ) میں واقع قانون بین الممالک کی اکادمی کے نصاب کی تکمیل بھی کی،

ترکی آنے کے بعد پہلے وزارت تعلیم میں اعلیٰ تعلیم کے جنرل ڈائرکٹوریٹ (نظامت عامہ) میں معاون ہوئے، پھر ۱۹۳۰ء میں انقرہ کی قانون کی فیکلٹی میں معاون پروفیسر کا امتحان دے کر یونیورسٹی سے ملحق ہوگئے، یہاں رومی قانون ان کا موضوع تھا، ایک سال بعد وہ پروفیسر ہوگئے، ۱۹۳۳ء میں استنبول یونیورسٹی میں آئینی قانون کے پروفیسر ہوگئے اور اس منصب پر وہ ۱۹۶۳ء تک فائز رہے، اس سال ترکی کی فوجی حکومت نے ایک سو سینتالیس افراد کو یونیورسٹی سے برطرف کردیا، ان میں علی فواد باشگل بھی تھے، اگرچہ بعد میں قانوناً برطرفی کالعدم قرار دے دیا گیا، لیکن وہ پھر یونیورسٹی واپس نہیں آئے،

یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران انھوں نے تجارت اور اقتصادیات کے اعلیٰ مدرسہ میں (۱۹۳۶ء) اور مکتب ملکیہ (سول سروس کا مدرسہ) میں بھی فرائض انجام دیے، ۱۹۳۹ء

میں وہ استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ قانون کے صدر بھی ہوگئے تھے،

اس دوران میں علی فواد باشگل نے متعدد قانونی اور آئینی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، انھوں نے ترکی میں پہلی مرتبہ مزدوروں سے متعلق قوانین پر لکچر دیئے، ۱۹۳۶ء میں جب فرانس نے خطائے (Hatay) کا صوبہ شام سے الگ کرکے آزاد علاقہ قرار دیا، تو انھوں نے صوبہ کا آئین تیار کیا، اور خطائے کے ترکی کے ساتھ الحاق سے متعلق جمعیۃ اقوام کے کمیشن کے اجلاس میں شرکت کے لیے ترکی وفد کے مشیر قانون کی حیثیت سے جنیوا گئے، ۱۹۴۱ء میں حکومت جرمنی کی دعوت پر علوم نظم ونسق کی اکادمی کی کانگریس میں شرکت کے لیے برلن گئے، علی فواد باشگل نے قانون بین الممالک کے انسٹی ٹیوٹ کے رکن کی حیثیت سے نِس (یوگوسلاویا)، میڈرڈ، لزبن اور استنبول کی کانگریس میں شرکت کی،

جمعیت اشاعت حریت افکار علی فواد باشگل، آزادی فکر، انسانی حقوق اور جمہوری اقدار کے بہت بڑے علمبردار تھے، انھوں نے یونیورسٹی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے ان افکار کی اشاعت کے لیے سرگرمی سے کام کیا، اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اگرچہ ترکی میں بادشاہت کو ختم کرکے ۱۹۲۳ء میں جمہوریت قائم کردی گئی تھی، لیکن اس جمہوریت نے جلد ہی آمریت کی شکل اختیار کرلی تھی، جمہور خلق پارٹی (ری پبلکن پیپلز پارٹی)، ستائیس سال تک واحد پارٹی کی شکل میں حکمراں رہی، اور اس دوران میں اس پارٹی کی حکومت نے اپنی اصلاحات کے خلاف ہر قسم کی سرگرمیوں کو کچل دیا تھا، اور مخالف مطبوعات اور اخبارات پر پابندیاں لگادی تھیں، علی فواد باشگل نے اس جبر کے خلاف آواز بلند کی، تعلیمی لکچروں کے ذریعہ بھی، اور مضامین اور کتابوں کے ذریعہ بھی، انھوں نے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے اپنی مطبوعات میں قانون، حقوق اور آزادی کے مسئلوں پر

علمی انداز میں بحث کی، اس زمانے میں انہوں نے جو کتابیں اور رسالے لکھے، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) فرد کے حق اور آزادی کا کلاسیکی نظریہ اور سرکاری کنٹرول کا جابرانہ نظام (۱۹۳۸ء) (۲) ترکی کا آئین اور سیاسی حکومت (۱۹۳۹ء) (۳) عالمی امن اور انسانی حقوق (۱۹۴۸ء) (۴) ترکی زبان کا مسئلہ (۱۹۴۸ء) (۵) شہری آزادی اور اس کی ضمانت (۱۹۴۸ء) (۶) ڈیموکریسی اور حریت (۱۹۴۹ء)،

۱۹۴۷ء میں علی فواد باشگل نے "جمعیت اشاعت حریت افکار" قائم کی، جس نے سیاسی جبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کی اور جدوجہد کی، علی فواد باشگل اپنے لکچروں کی وجہ سے طلبہ میں پہلے ہی ہردلعزیز ہو چکے تھے، اب اس جمعیت کی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا وسیع حلقوں میں تعارف ہوا، اور وہ ترکی کی ایک مقبول اور مشہور شخصیت بن گئے۔ مصطفےٰ کمال کے انتقال کے بعد عصمت انونو کے دور صدارت میں وہ ہر ناجائز اور خلاف قانون طریقوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے، اس دور پر علی فواد باشگل کو تین سب سے بڑے اعتراضات تھے،

اول یہ کہ سیاسی اور اقتصادی میدان میں سخت کنٹرول قائم کر کے ملک کو ایک عظیم فوجی بارک میں تقسیم کر دیا گیا ہے، حکومت کے اختیارات بے انتہا ہو گئے ہیں، اقتصادی میدان میں سرکاری اجارہ داری کی وجہ سے نجی کاروبار بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے ان دونوں اسباب کی وجہ سے ملک پر ایک آہنی پردہ ڈال دیا گیا ہے، اور ہر طبقے کے لوگ بے چون و چرا حکومت کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں،

دوم یہ کہ سیکولرازم کے اصول کی غلط تشریح کی جا رہی ہے، مغرب میں اس اصطلاح

کی تعریف یہ کی جاتی ہے، کہ ریاست اور کلیسا کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے، اور ریاست کو دنیوی امور تک اور مذہب کو اخروی امور تک محدود رکھا جائے، لیکن انونو نے اس کی بالکل مختلف تعریف کی ہے، اور کمیونسٹوں کی طرح مذہب کی مخالفت شروع کر دی، اور سیکولرازم کو ایک ایسی مادہ پرستی کی شکل دے دی، جس کا مقصد لوگوں کے دلوں سے دین اور اللہ کی محبت نکالنے کے لیے جدوجہد کرنا ہو،

سوم قوم پرستی کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے، جو ملی عقائد اور روایات کے خلاف ہے، اس غلط قوم پرستی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ترکی زبان سے عربی اور فارسی کے ۵۰۰ الفاظ بھی نکال دیئے گئے ہیں، جو صدیوں سے ترکی زبان کا ایک حصہ بن گئے تھے، اور اس طرح ایک مصنوعی زبان اختیار کی گئی ہے، ۱۹۴۳ء میں ترکی آئین کی زبان بھی بدل کر نئی مصنوعی زبان اختیار کی گئی، جس کی وجہ سے یہ آئین ناقابل فہم بن گیا،

ڈیموکریٹ پارٹی کا دور

۱۹۲۳ء سے ترکی میں ایک ہی سیاسی جماعت کی حکومت رہی تھی، اس دوران میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں ایک مخالف پارٹی قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی، چنانچہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۴ء کو ترقی پرور جمہوریت پارٹی کے نام سے ایک حزب اختلاف قائم کی گئی تھی لیکن اس کو سات ماہ بعد ہی ۵ جون ۱۹۲۵ء کو حکومت نے توڑ دیا، اس کے بعد ۱۲ اگست ۱۹۳۰ء کو سربست (لبرل) جمہوریت پارٹی وجود میں آئی، لیکن تین ماہ بعد، ۱۷ نومبر کو وہ بھی توڑ دی گئی، ۱۹۳۸ء میں مصطفےٰ کمال کے انتقال کے بعد کچھ تو ترکی میں جمہوریت کی بحالی کے لیے دباؤ بڑھا، اور کچھ دوسری جنگ کے بعد بیرونی دباؤ بڑھا، دوسری عالمی جنگ ختم ہونے پر جب اقوام متحدہ وجود میں آئی، اور ترکی نے اس کا رکن بن کر جمہوری اصولوں کو فروغ دینے کی پابندی قبول کی، تو ۱۹۴۵ء

میں ترکی میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کے قیام کی اجازت مل گئی، اس کے بعد خلق پارٹی کے کچھ سابق ارکان نے جن میں جلال بایار، عدنان مندریس اور فواد کوپرولو کے نام نمایاں ہیں ۷/جنوری ۱۹۴۶ء کو ڈیموکریٹ پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی، اس جماعت نے جو عوام کی امنگوں کی ترجمان تھی، ۱۴/مئی ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں سرکاری خلق پارٹی کو عبرتناک شکست دیکر اس کی ستائس سالہ اجارہ داری ختم کردی، ڈیموکریٹ پارٹی اس کے بعد ۱۹۶۱ء کے فوجی انقلاب تک برسراقتدار رہی، علی فواد باشگل کے خیال میں ترکی صحیح جمہوریت سے اسی دور میں روشناس ہوا، اور اس کا سہرا عدنان مندریس کے سر ہے، جو علی فواد باشگل کے خیال میں مصطفےٰ کمال کے بعد ترکی کے سب سے ہردلعزیز رہنما تھے،

ڈیموکریٹ پارٹی کے دور میں جو اصلاحات کی گئیں، ان میں سے تین کا علی فواد باشگل نے خاص طور پر خیر مقدم کیا، اول اذان کا عربی زبان میں دینے کی اجازت ملنا، دوم دینی تعلیم کا نفاذ اور سرکاری مدرسوں میں چوتھی جماعت کے بعد ماں باپ کی مرضی سے دینی تعلیم کی اجازت، اور سوم آئین کو اس کی اصلی زبان میں بحال کرنا،

دینی تعلیم

جہاں تک دینی تعلیم کے نظام کی بحالی اور فروغ کا تعلق ہے، اس میں علی فواد باشگل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ڈیموکریٹ پارٹی کے دور میں سرکاری مدرسوں میں دینی تعلیم کی اجازت کے علاوہ امام وخطیب کی ٹریننگ کیلیے مدرسے بھی قائم کیے گیے، تاکہ مسجد کے لیے اماموں اور مبلغوں کی تربیت کی جاسکے، لیکن علی فواد باشگل کے خیال میں اس نوعیت کے مدرسے دینی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے تھے، یہ تقاضے اعلیٰ دینی تعلیم کے ذریعہ ہی پورے کیے جاسکتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے حکومت کو ایک مکمل تعلیمی پروگرام

مرتب کرکے دیا جو ان کی مشہور کتاب "دین اور سیکولرازم" میں موجود ہے، ترکی میں اعلیٰ تعلیم کا پہلا اسلامی انسٹی ٹیوٹ جو ۱۹۵۹ء میں قائم کیا گیا بنیادی طور پر علی فواد باشگل ہی کی سوچ کا نتیجہ تھا، اسکی تفصیل خود ان کی زبان سے سنئیے، وہ کہتے ہیں:

"۲۱/دسمبر ۱۹۵۹ء کو وزارت تعلیم کے خصوصی دفتر کے سکریٹری نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ وزیر تعلیم جن کا ڈیموکریٹ پارٹی سے تعلق تھا، مجھ سے ملنے کے لیے سہ پہر کو آرہے ہیں، وزیر تعلیم عاطف بندرلی اوغلو، انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے سابق طالب علم رہ چکے ہیں، چنانچہ وہ وقت پر پہنچ گیے، اور مزاج پرسی کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا: میرے عزیز استاذ! میری آپ سے ایک درخواست ہے، اور وہ یہ کہ استنبول میں قائم ہونے والے یوکسک اسلام انسٹی ٹیوٹ (اعلیٰ اسلامی ادارہ) میں مدیر (ڈائرکٹر) کی جگہ خالی ہے، اور ہم اس کے لیے آپ کو سب سے موزوں شخص سمجھتے ہیں، ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ آپ کی سوچ کا نتیجہ ہے، اگر آپ اس فرض کی ذمہ داری قبول کریں، تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا،"

میں نے وزیر تعلیم کا شکریہ ادا کیا، اور اس ادارے کے قیام سے مجھے جو مسرت ہوئی، اس کا بھی ذکر کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں خود کو اس بلند منصب کے لائق نہیں سمجھتا، میں ایک گنہگار بندہ ہوں اور دین پر عمل کرنے کے معاملے میں مجھ میں کوتاہی پائی جاتی ہے، دینی تعلیم کے ایسے بلند ادارے کی سربراہی کے لیے صرف علمی قابلیت کا ہونا کافی نہیں، بلکہ آدمی میں زہد و تقویٰ بھی ہونا چاہیے، اس لیے آپ مجھے معذور سمجھیں، وزیر تعلیم کا اصرار جاری رہا، اور میں

بھی انکار کرتا رہا، آخر کار انہوں نے مجھ سے کہا، کہ میں خود جا کر اس تعلیمی ادارہ کا معائنہ کروں، اور اس کی تشکیل اور نصاب کے بارے میں ایک پروگرام پیش کروں، چنانچہ میں اگلے دن وہاں گیا، اور تعلیمی ادارے کے اساتذہ اور طلبہ سے گفتگو کی، اور موجودہ نصاب کا خاکہ لینے کے بعد چند دن محنت کی، اور ایک طویل رپورٹ مرتب کرنے کے ساتھ ایک درسی پروگرام اس کے ساتھ منسلک کرکے وزیر تعلیم کو پیش کردیا۔[1]

یہ پروگرام اور نصاب جو پروفیسر علی فواد باشگل نے پیش کیا تھا، نظریاتی اور عملی دونوں ضرورتوں کو سامنے رکھکر تیار کیا گیا تھا، اس کے مطابق نظریاتی ہدف یہ ہے کہ طالبعلم اسلام کو اس کے بنیادی سرچشمے قرآن اور سنت کے ذریعہ سمجھ سکے، اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا کیجائے کہ وہ اہل سنت کے طریقے پر قائم رہتے ہوئے ان دونوں قانونی ماخذوں کی مدد سے زمانہ کی ضروریات کے مطابق فیصلہ کرسکے، علاوہ ازیں ادارے میں ایسے لوگ اور عالم تیار کیے جائیں جو اسلامی اخلاق اور کردار کے مالک ہوں، کیونکہ ترکی اور تمام اسلامی دنیا کے موجودہ مصائب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ ایسے حکمرانوں اور علماء سے محروم ہوگئی ہے، جو باصلاحیت اور صاحب کردار ہوں۔[2]

تعلیمی پروگرام کے عملی مقاصد یہ ہیں کہ امام خطیب مدرسوں اور دوسرے دینی تعلیمی اداروں کے لیے اساتذہ کی ضرورت پوری کی جائے، اور ترکی میں ایسے مفتی اور واعظ تیار کیے جائیں، جو علم وثقافت کے زیور سے آراستہ ہوں، اس کے علاوہ خود انسٹی ٹیوٹ کے لیے اس کے اعلیٰ اغراض ومقاصد کو پورا کرنے والے لیکچراروں اور پروفیسروں کی تربیت کی جائے، اور اگر ممکن ہوسکے تو یونیورسٹیوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں کے جملہ اساتذہ کے لیے اعلیٰ صلاحیت کے افراد تیار کیے جائیں، اعلیٰ تعلیم کے ان اسلامی انسٹی ٹیوٹوں

[1] ینی آسیا، استنبول، [2] ایضاً

کے مضامین تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام جیسے خصوصی علوم پر مشتمل ہیں، آج ان انسٹی ٹیوٹوں کی تعداد نو ہوچکی ہے، لیکن علی فواد باشگل کی زندگی میں صرف چار انسٹی ٹیوٹ قائم ہوئے تھے، یہ انسٹی ٹیوٹ استنبول (۱۹۵۹ء) قونیہ (۱۹۶۲ء) قیصری (۱۹۶۵ء) اور ازمیر (۱۹۶۶ء) میں تھے۔

اسی زمانے میں علی فواد باشگل نے اپنی معرکہ آرا کتاب "دین اور سیکولرازم" لکھی، جس میں مذہب کی ضرورت اور دینی تعلیم اور مذہبی آزادی کی اہمیت کو جدید ترین انداز میں ثابت کیا،

خلق پارٹی کے حامیوں کو ترکی میں بڑھتی ہوئی دینی سرگرمیاں ناگوار گذریں، اور انہوں نے پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ ڈیموکریٹ پارٹی رجعت پسندوں کے آگے جھک گئی ہے، اور اتاترک کی اصلاحات کو ختم کرنا چاہتی ہے، اس موقع پر علی فواد باشگل نے ڈیموکریٹ پارٹی کی غلطیوں پر اس کو خبردار بھی کیا، اور مخالفوں کی خفیہ سازشوں سے باخبر بھی کیا، مئی ۱۹۶۰ء کے انقلاب سے پہلے جلال بایار نے ان کو انقرہ طلب کرکے سیاسی صورت حال پر ان سے تبادلہ خیال کیا، علی فواد باشگل نے حکومت کو مستعفی ہونے کا مشورہ دیا، لیکن جلال بایار نے یہ مشورہ تسلیم نہیں کیا۔[1]

فوجی انقلاب

۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کو بالآخر مصطفیٰ کمال کی اصلاحات کی حامی فوج نے ڈیموکریٹ پارٹی کی منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا، اور ملک میں مارشل لا لگا دیا، اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۱ء میں عدنان مندریس اور ان کے دو ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی، اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے علی فواد لکھتے ہیں:

[1] وہبی وقاص اوغلو:

"آخر کار ستمبر ۱۹۶۱ء کے ایک ابر آلود اور اداس دن مندریس اور ان کے دو ساتھیوں فطین رشدو زورلو، اور حسن پولاد کان کو سزائے موت دینے کے لیئے بحیرہ مرمرہ کے ایک دوسرے جزیرے امرالی میں لے جایا گیا، روشن خیال اور دولت مند زراعت پیشہ خاندان کے ہونہار فرزند مندریس کی زندگی کا یہاں خاتمہ کر دیا گیا، کون تصور کر سکتا تھا کہ اس نرم دل، شائستہ اور مخلص انسان کی روشن سیاسی زندگی کا چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح یوں پھانسی کے تختے پر لے جا کر خاتمہ کیا جائے گا، لیکن تقدیر کا لکھا اسی کو کہتے ہیں۔"

۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان کی وجہ سے علی فواد باشگل پہلی مرتبہ عملی سیاسی زندگی میں داخل ہوئے، فروری ۱۹۶۱ء میں جب عدالت پارٹی قائم ہوئی تو وہ اس میں شامل ہو گیے، اس سے قبل ان کو ایک تحریر کی وجہ سے ان کو گرفتار کر کے بال موجو کے فوجی قید خانہ کے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا تھا، جہاں وہ تین ماہ نظر بند رہے، آخر کار، مارشل لا عدالت نے ان کو بری کر دیا، علی فواد باشگل عدالت پارٹی کی مدد سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو صامسون سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ترکی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے، ان کو عدالت پارٹی کی طرف سے صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا، لیکن انہوں نے بعض نامعلوم اسباب کی وجہ سے اپنا نام واپس لے لیا، اور سینٹ کی رکنیت سے بھی استعفٰی دے دیا، کہا جاتا ہے کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں، چنانچہ وطن کے اتحاد اور یکجہتی کی خاطر وہ ان بلند مناصب سے دست بردار ہو گیے، ۱۹۶۲ء میں وہ ترکی چھوڑ کر جنیوا چلے گیے، جہاں ان کو جنیوا یونیورسٹی میں ترکوں کی تاریخ اور زبان کے شعبہ کا چیرمین مقرر کیا گیا،

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے زمانہ میں علی فواد باشگل نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں "۱۹۶۰ء کے انقلاب

اور اس کے اسباب" کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی، اس میں انہوں نے ۲۷ مئی کے واقعہ کو حادثۂ فاجعہ و فلاکت کہا ہے، اور لکھا ہے کہ فوج نے آئین کی خلاف ورزی کی ہے، اور بیرون ملک حکومت کی ساکھ کو نقصان پہونچایا ہے، اس کتاب میں انہوں نے سماجی امداد اور سماجی تحفظ کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث بھی کی ہے، صدر انونو کی حکومت نے جو ۱۹۶۱ء کے انتخاب میں فوج کی مدد سے کامیاب ہو گئی تھی، اس کتاب کی وجہ سے علی فواد باشگل کو مجرم قرار دیا، اور ۱۹۶۴ء میں ان پر ترکی کی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا، اور سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے ان کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کیا، اس واقعہ کی تفصیل خود علی فواد باشگل سے سنیئے، وہ کہتے ہیں کہ:

"لوزان سے میری روانگی سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے گھر پر ایک ٹیلیفون آیا، میں نے رسیور اٹھایا تو مخاطب نے بتایا کہ وہ پروفیسر علی فواد سے گفتگو کرنا چاہتا ہے، وہ لوزان کا سکیورٹی افسر تھا، اس نے کہا کہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ کل دس بجے میرے دفتر آنے کی زحمت کریں، چنانچہ دوسرے دن میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دفتر گیا، اور سکیورٹی افسر کے سامنے میز پر بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ میں میری کتاب تھی، جس کو دکھاتے ہوئے اس نے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی اس کتاب کی وجہ سے آپ پر حکومت ترکی نے ترکی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے، میں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم ہے، افسر نے کہا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہم صرف اُن کتابوں کی تفتیش کرتے ہیں، جو عام آداب و اخلاق کے خلاف ہوں، باقی کسی کتاب پر اشاعت کی پابندی نہیں، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات

نہیں لی، لہٰذا آپ ہمارے ملک میں آرام سے رہ سکتے ہیں، اگر کوئی آپ کو پریشان کرے، تو اس ٹیلیفون نمبر پر فوراً اطلاع دیجئے، فوراً کارروائی کی جائے گی۔"[1]

دراصل ترکی کی مخلوط حکومت نے سوئٹزرلینڈ میں ترکی سفیر کے ذریعہ علی فواد باشگل کو ملک بدر کرانے کی کوشش کی تھی، لیکن کتاب چونکہ کسی قسم کی قانونی خلاف ورزی نہیں تھی، اس لیے یہ مطالبہ رد کردیا گیا، اس کے بعد استنبول کی عدالت نے بھی ان کو بری کردیا، عدالت میں ان کے وکلائے صفائی نے کہا تھا کہ "پروفیسر باشگل جیسے اہل علم افراد کی دوسرے ملکوں میں بھی عزت کی جاتی ہے، یہ افسوس کی بات ہے کہ ہم ان کو قاتلوں اور ڈاکوؤں کی طرح عدالت جرائم میں گھسیٹ کر لائیں۔"[2]

۱۹۶۵ء کے انتخابات میں عدالت پارٹی اکثریت سے کامیاب ہوگئی، اور ترکی میں عصمت انونو کی مخلوط حکومت کی جگہ عدالت پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی، ڈاکٹر علی فواد باشگل عدالت پارٹی کے ٹکٹ پر مجلس کبیر ملی کے رکن منتخب ہوئے۔

بدیع الزماں سعید نورسی جدید ترکی کی ایک متنازعہ دینی شخصیت رہے ہیں، خاص طور پر کمیونسٹ، ملحد اور سیکولر عناصر جن میں عصمت انونو بھی شامل تھے، ان کے شدید مخالف تھے، لوگ اس ڈر سے کہ ان پر رجعت پسندی کا الزام نہ لگ جائے، سعید نورسی کے حق میں بولنے سے جھجکتے تھے، لیکن ڈاکٹر علی فواد باشگل پہلے شخص ہیں جو ترکی پارلیمنٹ میں سعید نورسی اور نور طلبہ کے مسئلے کو زیر بحث لائے، انہوں نے نہ صرف اس مسئلہ پر بحث کی بلکہ ضمیر کی آزادی کے حوالے سے اس کا دفاع بھی کیا، ۱۹۶۶ء میں ایک مقدمہ میں سعید نورسی مرحوم کی خدمات کا دفاع

[1] وہبی دتاص اوغلو؛ [2] ایضاً۔

کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"آجکل سعید نورسی کی ایمانی اور اخلاقی تحریک کو سیاسی تحریک ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جس کی وجہ سے یہ تحریک سیاست دانوں کی استعماری ذہنیت کا شکار ہوگئی ہے، میں سعید نورسی کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا، ویسے بھی آدمی کو دیکھنا ضروری نہیں ہے، اس کے کام کو دیکھنا چاہیے، اور یہ بات محقق ہے کہ وہ ہمارے ملک کے معروف ترین اور عظیم ترین عالم دین تھے، ان کی تحریک نے ہمارے زمانے میں گناہ کے دریا میں غلطاں اور بیچارے انسانوں کو نجات دلانے کی خدمت انجام دی ہے، سعید نورسی کے رسائل نور بھی سیاسی نوعیت کے نہیں ہیں، میں نے ان میں اس قسم کی کوئی بات نہیں پائی، اس کے برعکس میں نے ان میں ایمان اور اخلاق کی پرزور تعلیم دیکھی، میں نے بارہا نور طلبہ کو دیکھا ہے اور ان سے باتیں کی ہیں، سب کو بااخلاق اور نیک پایا، آخر نور طلبہ سے اس دشمنی کی وجہ کیا ہے؟ میں کسی طرح یہ بات سمجھ نہیں سکا، نورسی تحریک نہ کوئی صوفیانہ طریقت ہے، نہ وہ مذہب ہے، اور نہ سیاسی نوعیت کی چیز، وہ صرف اور خالص اسلام ہے۔"

مجلس کبیر ملی کا رکن ہونے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد علی فواد باشگل کا ۱۷ اپریل ۱۹۶۷ء کو استنبول میں انتقال ہوگیا، ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے جنازہ میں لوگوں نے اتنی بڑی تعداد میں شرکت کی، جس کی ماضی قریب میں مثال نہیں ملتی،[1]

تصانیف | ڈاکٹر علی فواد باشگل قانونی، سیاسی اور سماجی موضوع پر متعدد چھوٹی بڑی کتابوں

[1] روزنامہ ینی آسیا، استنبول، ۱۷ اپریل ۱۹۶۷ء،

کے مصنف تھے، وہ ترکی کے نہایت عمدہ اور صاف ستھری تحریر لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں، علمی اور مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب تحریر عام فہم، دلچسپ اور دلکش ہے، ترک دیلی وادبیاتی انسی کلوپیڈیسی میں ان کی سولہ تصانیف کی فہرست دی گئی ہے[1]، جو حسب ذیل ہیں ہر کتاب کے سامنے اس کے پہلے ایڈیشن کا سال دیا ہوا ہے:

(۱) ترکی کا آئین اور سیاسی حکومت (۱۹۳۹ء) فرانسیسی زبان میں بلجیم میں چھپی (۲) فرد کے حق اور آزادی کا کلاسیکی نظریہ اور سرکاری کنٹرول کا جدید نظام (۱۹۳۸ء) (۳) درسہاے قانون اساسی (۱۹۴۰ء) تین جلد (۴) ترکی میں مزدوروں کا قانون (۱۹۴۰ء) (۵) شہریوں کا مجلس کبیر ملی کو مراجعت کرنے کا قانون (۱۹۴۴ء) (۶) قانون کا بنیادی مسئلہ اور ادارے (۱۹۴۷ء) (۷) عالمی امن اور انسانی حقوق (۱۹۴۸ء) (۸) ترکی زبان کا مسئلہ (۱۹۴۸ء) (۹) شہری آزادی اور اس کی ضمانت (۱۹۴۸ء) (۱۰) ڈیموکریسی اور حریت (۱۹۴۹ء) (۱۱) نوجوانوں کے روبرو (۱۹۴۹ء) پچاس صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ نوجوانوں اور طلبہ کی تربیت کے لیے بہترین کتاب ہے، (۱۲) دین اور سیکولرازم (۱۹۵۵ء) یہ شاید پروفیسر باشگل کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے، اس میں انہوں نے مذہبی عقیدہ کی ضرورت اور مذہبی تعلیم اور آزادی کی اہمیت کو نہایت دلکش طریقے پر دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے، اور اعلیٰ دینی تعلیم کے ادارے قائم کرنے پر زور دیا ہے، یہ کتاب دو حصوں میں چھپی تھی، پہلا حصہ ۱۹۵۴ء میں چھپا اور دوسرا ۱۹۵۵ء میں، دوسرے حصہ کے آخر میں انہوں نے صفحہ ۱۲۰ سے ۱۳۱ تک دینی تعلیم کے نظام کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے، (۱۳) شہری حقوق اور حریت اور ہمارے آئین کے نقائص (۱۹۶۰ء) دو جلد (۱۴) علم کی روشنی میں موجودہ مسائل (۱۹۶۰ء) (۱۵) جمہوریت کی راہ میں (۱۹۶۱ء)

[1] ترک دیلی وادبیاتی انسی کلوپیڈیسی جلد اول ص ۳۴۲، ۳۴۳ (۱۹۷۷ء استنبول)

(۱۶) ۲۷ رمئی ۱۹۶۰ء کا انقلاب اور اس کے اسباب (۱۹۶۳ء) یہ کتاب فرانسیسی زبان میں دسمبر ۱۹۶۳ء میں جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں چھپی تھی، تنکر داوغلو نے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا، جو ۱۹۶۶ء میں یغمور یانیلری استنبول نے شایع کیا،

مذکورہ بالا فہرست کے بعض چھوٹے کتابچے ان کی بڑی کتابوں "جمہوریت کی راہ میں" اور "علم کی روشنی میں موجودہ مسائل" میں شامل کر لیے گیے ہیں۔

علی فواد کی کتاب "۲۷ رمئی کا انقلاب اور اس کے اسباب" میں دو اور کتابوں کا تذکرہ ہے، ایک "بوغاز لر مسئلہ سی" (دردانیال اور باسفورس کا مسئلہ) جو ۱۹۲۶ء میں پیرس سے شایع ہوئی، اور دوسری "قانون کے بنیادی مسائل" جو ۱۹۴۴ء میں استنبول سے شایع ہوئی، ان میں پہلی کتاب ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے،

افکار علی فواد باشگل سیکولرازم کے علمبردار تھے، یعنی دین اور حکومت کو نہ صرف یہ کہ اپنے وظیفوں کے لحاظ سے الگ الگ سمجھتے تھے، بلکہ سعید نورسی کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ مذہب کو حکومت کے کاموں میں اور حکومت کو دینی امور میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے، رہا وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مصلحتاً کہتے تھے، یا واقعی ان کا یہی خیال تھا؟ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر قطعی رائے دینا مشکل ہے، ویسے ان کی تحریروں میں جگہ جگہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام ایک جامع نظام ہے جو صرف اعتقادات اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ دنیوی امور میں بھی رہنمائی کرتا ہے، بہر حال اگر وہ سیکولرازم کے واقعی علمبرداروں میں سے تھے، تو بھی انہوں نے اس کی جو تعبیر کی ہے وہ خلق پارٹی اور اس کے ہمنواؤں کی تعبیر سے بالکل مختلف ہے، اور یہ اسی تعبیر کا نتیجہ ہے کہ ترکی میں سرکاری سطح پر مذہب دشمن سرگرمیوں کا خاتمہ ہوا، اور ڈیموکریٹ پارٹی اور اس کے بعد عدالت پارٹی کے دور میں دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، اور حکومت نے

ان کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی کی۔

علی فواد باشگل ترکی زبان میں عبادت اور اذان کے خلاف تھے، اس بارے میں انہوں نے اپنے عقیدے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"اسلام میں عبادت کی زبان قرآن ہے، اور قرآن اپنے کلمات، الفاظ، روح اور معانی کے ساتھ قرآن ہے، قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہے، اور قرآن کے ترجمہ کے ساتھ جو عبادت کی جائے گی، وہ اسلامی عبادت نہیں ہوگی، فی الحقیقت قرآن کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ناممکن بھی ہے اور بے معنی اور بلا جواز بھی ہے۔"[1]

اس طرح علی فواد باشگل یورپ کی تحریک اصلاح دین کے انداز پر اسلام میں اصلاحات کرنے کے خلاف تھے، جس پر اس زمانے میں ترکی میں بہت زور دیا جاتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ اصلاح اس چیز میں کی جاتی ہے جس میں تحریف ہو گئی ہو، اسلامی تعلیمات قرآن و سنت کی شکل میں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہیں، اس لیے اصلاح[2] کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وہ ترکی زبان سے ان عربی اور فارسی الفاظ کو نکالنے کے خلاف بھی تھے، جو ترکی زبان میں تاریخی عمل کے تحت رائج ہو چکے تھے، اور ٹھیٹ ترکی کو جسے جمہوری دور میں خصوصاً خلق پارٹی کے دور حکومت میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک مصنوعی زبان تصور کرتے تھے۔

علی فواد باشگل ترک قومیت کو اہمیت دیتے تھے، لیکن اس قومیت کو جس کے خمیر میں اسلام شامل ہے، اسی طرح وہ اتحاد اسلامی کے علمبردار بھی تھے، حالانکہ اس زمانہ میں ترکی میں اسلام کے نام پر مسلمان ملکوں کو متحد کرنا ایک رجعت پسندانہ فعل سمجھا جاتا تھا، علی فواد باشگل ۱۹۵۲ء میں پاکستان میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، اور اس میں انہوں نے

[1] دین اور سیکولرازم (ترکی زبان)، حصہ دوم صـ ۲۲ (استنبول ۱۹۵۵ء) [2] دین دہ رفارمجو (دین میں اصلاح کرنے والے)

تقریر بھی کی تھی، واپسی پر انہوں نے روزنامہ "بیوک دوغو" (عظیم مشرق) میں اپنے دورۂ پاکستان کے تاثرات پر بارہ[12] مقالے لکھے تھے، ذیل میں ان میں سے دو مقالوں کے اقتباسات دیئے جارہے ہیں، تاکہ اتحاد اسلامی سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے، وہ لکھتے ہیں:

"دوسری عالمی جنگ کے بعد کے دور کی ایک نمایاں خصوصیت بین الاقوامی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ممالک مختلف بلاکوں میں شامل ہو رہے ہیں، تمام اقوام اپنے حالیہ فائدوں کے لیے تاریخی اور سیاسی یگانگت کے لحاظ سے اور مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک ایک بلاک بنا کر متحد ہو رہی ہیں، سلافی قوموں کے طفیلی بلاک کے مقابلہ میں اینگلو امریکی بلاک اسی وجہ سے بنا ہے۔

جب یہ صورت ہے تو مسلمان اقوام کیوں متحد نہیں ہوتیں؟ اور چالیس کروڑ انسانوں اور صاحب ایمان لوگوں کا بلاک کیوں قائم نہیں کرتیں؟ اگر وہ ایسا کریں تو اس سے صرف مسلمانوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچے گا، دنیا کے امن کو بھی فائدہ پہنچے گا، اس وقت اسلامی دنیا کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ ہے، یعنی اپنے وجود کا تحفظ کرنا، نظریاتی جنگ اور جوع الارض ان کا مقصد نہیں، لہذا مسلمان قوموں کے اتحاد کا مقصد امن اور انسانیت کے تحفظ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

آج وہ قومیں جو بلاک بنا کر متحد ہو رہی ہیں، ان کا مقصد عارضی خطروں کا انسداد اور مختلف مفادات کا تحفظ ہے، جبکہ مسلمان اقوام کو چودہ سو سالہ تاریخ نے ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے، اور اسلامی دنیا میں عملی طور پر ایک طرح کا اتحاد موجود ہے، اب ہمارے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہمارے درمیان جو تاریخی اور دینی رشتے ہیں، ان کو تقویت دی جائے، اور نسلی، لسانی اور قومی اختلافات سے بلند

ہو کر اور ان اختلافات کے منفی اثرات کو برطرف کر کے مشترک شعور پیدا کیا جائے۔"
(بیوک دوغو، ۱۵ رجون ۱۹۵۲ء)

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں ایک بات کی طرف اور توجہ دلانا چاہتا ہوں، اسلام دشمن عناصر اتحاد اسلامی کو ایک خطرناک چیز تصور کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر اس قسم کی کوشش کی گئی تو مسیحی دنیا ہمارے خلاف ہو جائے گی، اور ان کے درمیان ایک نئی صلیبی روح بیدار ہو جائے گی، یہ لوگ اس قسم کے وہم اور اندیشے پیدا کر کے ایک طرف مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف عوام کو ارباب اقتدار کے خلاف بھڑکانا چاہتے ہیں، میں دوسرے مسلمان ملکوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا، لیکن ترکی میں ایسے صحافی موجود ہیں، جو ہر وقت اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں، یقین کیجئے کہ یہ ایک چال ہے، اور شکست خوردہ[1] عناصر کے ذہنوں کی شرارت ہے، مسیحی یورپ متحد ہو جاتا ہے، اپنا وفاق بناتا ہے، اور امریکہ سے تعاون کرتا ہے، اور ہم مسلمان اس کا مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں، کیونکہ اس میں امن کی ضمانت نظر آتی ہے، ہم اس کی ان کوششوں کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتے، اور ہمارے ذہنوں میں ماضی بعید کے اہل صلیب کے افسانے تازہ نہیں ہوتے، اور ہو بھی نہیں سکتے، کیونکہ دینی جنگوں کا زمانہ اب ماضی کی بات ہو چکی ہے، آج فی الحقیقت نہ تو مسیحی مغرب اسلامی دنیا کا دشمن ہے، اور نہ اسلامی دنیا مسیحی مغرب

---

[1] خلق پارٹی (ری پبلکن پیپلز پارٹی) کی طرف اشارہ ہے، جس نے ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹ پارٹی سے عبرتناک شکست کھائی تھی، اور ڈیموکریٹ پارٹی کے چارسو آٹھ (۴۰۸) ارکان کے مقابلے میں اس کے صرف انہتر (۶۹) ممبر منتخب ہوئے تھے۔

کی دشمن ہے، دشمن کوئی دوسرا ہے، جو ہمارا اور مغرب کا دونوں کا دشمن ہے، اس دشمن کو ہر شخص جانتا ہے، اگرچہ دشمن کسی کو نظر نہیں آتا، اور اس کو کوئی نہیں جانتا تو وہ صرف وہ لوگ[1] ہیں جو تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔" (بیوک دوغو، ۲۸ رجون ۱۹۵۲ء)

آخر میں ہم علی فواد باشگل کی تحریروں سے چند اور اقتباسات دے کر مضمون ختم کرتے ہیں:

"سیاست کی ہوس ایک ابتلا ہے، اور بدترین ابتلا، جو شخص سیاست کے بھیڑیے کا شکار ہو جاتا ہے، تو وہ پیچ و تاب کھاتا ہے، تڑپتا ہے، لیکن اس ابتلا اور مصیبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا، ہمارے زمانے میں سیاست بازی کی مثال شہد کے چھتے کی طرح ہے، جس میں مکھیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے، لوگ ایک دوسرے کو دھکیل کر سیاست کے اسی چھتے کی طرف لے جاتے ہیں۔"

"ہر شخص کو یہ مقدس حق حاصل ہے کہ وہ جس دین، فلسفے، سیاسی، اقتصادی نظریے یا عقیدے کو چاہے پسند کرے، اور اپنے اس عقیدے اور خیال کو بغیر کسی خوف و ہراس کے ظاہر کر سکے، اسی طرح عبادت اور دینی احکام و رسوم پر عمل کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، بشرطیکہ یہ باتیں امن عامہ اور اخلاق کے منافی نہ ہوں۔"

"اس مملکت کے نوجوانوں میں وطن سے حقیقی محبت کرنے کی بجائے تعیش اور آرام پسندی کا جذبہ سرایت کر گیا ہے، وہ صرف کھانے، پینے اور تفریح کو زندگی سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ کم سے کم محنت کے ذریعہ دولت اور عیش و آرام میسر آجائے، اور بلند سے بلند مقام تک پہنچ جائیں۔"

---

[1] مذکورہ بالا دونوں اقتباسات علی فواد باشگل کی کتاب "دین اور سیکولرازم" حصہ دوم صفحہ ۳۴۳، صفحہ ۳۵۵ کے حاشیہ سے لیے گئے ہیں۔

"ہم ایک خوفناک اخلاقی بحران سے دوچار ہیں، لیکن اس اخلاقی بحران کی ایک اصل وجہ ہے، اور وہ ہے دینی بحران، اخلاق کا سرچشمہ اقتصادی نہیں ہے کیونکہ خوش حال اور روشن خیال طبقہ سب سے زیادہ اس بگاڑ کا شکار ہے، اور وہی تمام سماجی بحرانوں کا باعث ہے، جس ملک میں جھوٹ، دھوکہ، فریب جیسی بداخلاقیاں عام ہو جائیں، اس میں اقتصادی، علمی، فکری، مختصر یہ کہ تمدنی اور تہذیبی ترقی ناممکن ہو جاتی ہے۔"

"ایک مومن کے لیے اور ایک محافظ کار[1] محبت وطن کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مغرب کے علوم، فنون، تکنک، اخلاق کے بلند شعور اور روایتی دیانت کو جو مغربی تہذیب کی بنیادیں ہیں، پسند نہ کرے، آفتاب کی روشنی سے فرار تاریکی کے گڑھے میں گرنے کے مرادف ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دین، ایک محافظ کار محب وطن کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مغرب کے بگاڑ یعنی الحاد، مادہ پرستی، منفعت پرستی اور دنیا کی عارضی زندگی سے محبت کو پسند کرنے لگے۔"

دینی آزادی صرف عبادت گاہ میں جانے آنے کی آزادی کا نام نہیں ہے دین کی تعلیم، تدریس، تبلیغ اور نشر و اشاعت کا حق، اور دینی احکام پر عمل کرنے کا حق، دینی آزادی میں شامل ہے، یہ وہ معیار ہے جس کی بنیاد پر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کسی ملک میں دینی آزادی حاصل ہے یا نہیں۔"

"انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں محققوں نے جو تحقیق کی ہے، اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ دینی عقیدے اور احساسات بنی نوع انسان کے آغاز

---

[1] ترکی زبان میں (conservative) کے لیے لفظ محافظ کار استعمال کیا جاتا ہے۔

کے وقت سے موجود ہیں، اور ابتدائی تہذیبی کارنامے اور افکار ان ہی دینی عقیدوں کی وجہ سے پیدا ہوئے، حتیٰ کہ قانون، اخلاق، سیاست، تکنک اور فن کی ترقی، اور ان کا سرچشمہ بھی دینی احساسات ہیں، انسان زندگی کی منزلیں جیسے جیسے طے کرتا جاتا ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دینی عقیدے کے خلا کو نہ دولت پر کر سکتی ہے، نہ اثر و اقتدار، اور نہ کوئی دوسری دنیوی چیز، لوگ بالآخر اس حقیقت کو سمجھ جائیں گے کہ وہی ترقی اچھی اور مفید ہے، جس میں مادی ترقی کے ساتھ دینی اور روحانی ترقی کا بھی خیال رکھا جائے۔"

---

[1] مذکورہ اقتباسات دینی وقاص اوغلو کی کتاب "بو دطنی ترک ایدیلر" سے لیے گئے ہیں، اور بالعموم علی فواد باشگل کی کتاب "دین اور سیکولرزم" پر مبنی ہیں۔

علمائے فرنگی محل
کے
شجرۂ نسب پر ایک نظر

از جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، چیرمین اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ

(۳)

شیخ الاسلام ہروی کی اولاد

اگرچہ اب جب کہ انصاریان ہرات مقیم ہند و پاک کے مختلف شجرہائے نسب سامنے آچکے ہیں، جن سے شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہرویؒ (م ۴۸۱ھ) کی اولاد پسری ہونے کے شواہد مل گئے ہیں، پھر بھی ضمناً ان روایات پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، جو شیخ الاسلام کی صرف دختری نسل ہونے کے بارے میں بعض تذکروں میں مذکور ہیں،

رسالۂ قطبیہ کے مؤلف مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی (م ۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء) نے لکھا ہے، اور اسے "قصۂ عجیب" سے خود ہی تعبیر کیا ہے،

"شیخ الاسلام کے خاندان کے ایک صاحب نے جو ایرانی بادشاہ نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے ہوئے تھے (۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء) ملا نظام الدین سے آکر ملاقات کی اور پوچھا کہ آپ اپنے کو "شیخ" کیوں لکھتے ہیں، (سید کیوں نہیں لکھتے؟) شیخ الاسلام بے شک سید نہیں، شیخ تھے، لیکن ان کی اولاد نرینہ نہیں تھی، صرف ایک بیٹی تھیں جن کا

عقد شیخ الاسلام کے بھانجے کے ساتھ ہوا، بیٹی کے فرزند کو شیخ الاسلام نے متبنیٰ بنا لیا، جس کی اولاد شیخ الاسلام کی اولاد کہلانے لگی، اور "شیخ" لکھی گئی، حالانکہ یہ متبنیٰ سیدزادہ تھا، اور شرعاً نسب کا اعتبار باپ کی نسبت سے ہوتا ہے، ملا نظام الدین نے جواب میں کہا کہ خبر مشہور کو (کہ ملا نظام الدین کے اجداد شیخ انصاری ہیں) خبر واحد[1] کی بنیاد پر (محض ایک صاحب کے کہنے سے) ترک نہیں کیا جانا چاہیے"،

نادر شاہ کے ہندوستان پر حملے کے وقت ملا نظام الدین عمر کے ساٹھ سال پورے کر چکے تھے، اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک بھی، اس لیے نادر شاہ کے لشکریوں میں آئے ہوئے شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہرویؒ کے خاندان کے کسی فرد کا ملا صاحب سے ملاقات کے لیے دہلی سے لکھنؤ آنا محل تعجب نہیں، اور ملا صاحب کا جواب جس درجہ اصولی تھا، وہ بھی ان کے علمی مرتبے کے عین مطابق ہے، اور غیر ضروری تکرار سے احتراز، ملا صاحب کی افتادِ طبع کا پوری طرح مظہر،

تقریباً یہی روایت دوسرے الفاظ میں "قرۃ الابصار" کے مصنف مولانا محمد عبد الباقی فرنگی محلی (م ۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۵ء) نے بھی درج کی ہے، وہ شیخ الاسلام کے خاندان کے کسی فرد کے بجائے ہرات کے ایک ماہر انساب سے روایت شروع کرتے ہیں کہ:

"لوگوں کا کہنا ہے کہ ہرات کا ایک ماہر انساب، ملا نظام الدین کے پاس آیا، اور کہا کہ شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہرویؒ کے کوئی لڑکا نہ تھا، ایک بچے کو جو نسباً سید تھا، انہوں نے پرورش کیا تھا، چونکہ شیخ الاسلام ایک مشہور شخصیت تھے ان کا پرورش کردہ بچہ جو سید زادہ تھا، ان ہی کی نسبت سے "شیخ" کہلانے لگا"

[1] رسالۂ قطبیہ (فارسی مخطوطہ)

درحقیقت اس بچے کی اولاد سید ہے (یعنی آپ جو شیخ الاسلام ہروی کی اولاد ہیں، دراصل اس سیدزادے کی اولاد ہوئے، اس لیے سید ہوئے)

ملا صاحب نے فرمایا کہ اگر یہی سہی ہے تو اس کا فائدہ بروز قیامت ہی ملے گا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "بروز قیامت تمام انساب اور تمام رشتہ داریاں میرے نسب اور میری رشتہ داری کے سوا منقطع ہو جائیں گی۔"[1]

اس روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملا صاحب نے اس امر انساب کے بیان کو قابل قبول نہیں سمجھا، بحث و مباحثہ بھی لاطائل قرار دیا، اور ایک محدثانہ جواب دے کر سکوت اختیار فرمالیا۔

جیسا کہ اوپر گزرے شجرہائے نسب سے شیخ الاسلام کی پسری اولاد کا جن میں سے کئی صاحبزادوں کے نام بھی شجرہائے نسب کے ذریعہ معلوم ہو چکے، علم ہو چکا ہے، لیکن یہ سوال کہ ان کے پسری اولاد تھی یا نہیں، اٹھا کیوں؟

"قرۃ الابصار" کے مصنف کو، جب وہ مدینہ منورہ ہجرت کر چکے تھے، مدینہ شریف میں اس سوال کے اٹھنے کی بنا عجیب طرح سے معلوم ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"مدینہ منورہ میں ہرات سے ایک عالم آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ شیخ الاسلام کی نسل سے ہیں، مگر یہی لوگ ان کا "میر صاحب" کہہ کر ذکر کرتے تھے، میں متحیر کہ "میر" تو سید کو کہتے ہیں، انصاری، سید کیسے ہو گیا؟ ہرات کے ایک باشندے سے میں نے اپنی یہ پریشانی بیان کی تو اس نے بتایا کہ یہ "میر صاحب" شیخ الاسلام کی دختری نسل سے ہیں جو سید نسل ہے، اور شیخ الاسلام کی پسری نسل بھی ہرات میں موجود

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

ہے، مگر وہ بے دخل ہو چکی ہے، یعنی شیخ الاسلام کے مزار سے متعلق جو اوقاف ہیں ان پر دختری نسل نے تغلب حاصل کر لیا، اور شیخ الاسلام کی پسری نسل کے وجود ہی کی منکر ہو گئی، اب جب کہ مزار شیخ الاسلام کا دربست اور اس سے متعلق اوقاف کی آمدنیاں نواسے کی نسل کے قبضہ میں دی جا چکی ہیں، تو اب انکار اور تردید بھی بے محل ہو چکی ہے۔"[1]

شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کو جو اپنے عہد کے بڑے محدث تھے، اسماء الرجال اور تواریخ کی کتابوں میں ہر جگہ "ابو اسماعیل" عبد اللہ انصاری سے یاد کیا جاتا ہے، یہ خود واضح قرینہ ہے، کہ ان کے ایک صاحبزادے اسماعیل نامی تھے، جن سے ان کی کنیت "ابو اسماعیل" ہوئی، اوپر علاء الدین برناوی کا شجرۂ نسب مذکور ہو چکا ہے، جس میں علاء الدین برناوی کا شیخ الاسلام کے بیٹے اسماعیل نامی کی نسل سے ہونا بیان ہوا ہے۔

علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب میں (جو ورقۂ نسب پر مبنی ہے) شیخ الاسلام کے بیٹے جابر کو اس خاندان فرنگی محل کا جد امجد بتایا گیا ہے، یہ جابر اسمٰعیل کے حقیقی بھائی تھے۔

"قرۃ الابصار" کے مصنف نے جابر بن عبد اللہ انصاری ہروی کے بارے میں جو تاریخی حوالے دیئے ہیں، (جن کی مراجعت یا تصحیح نقل کا موقعہ راقم کو ابھی تک نہیں ملا ہے) بعینہٖ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

"سلک الدرر فی اعیان القرن العشر سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر بن عبد اللہ کی نسل میں ایک عالم حلب میں تھے، (دسویں صدی ہجری میں)، جن کا نام ہی "شیخ زادہ" تھا، ان کا شجرۂ نسب یوں ہے: شیخ زادہ بن جمال الدین بن احمد بن نعمت اللہ

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

ابن جنید بن جمال الدین بن محمد بن احمد بن مسعود بن عبداللہ بن جابر بن منصور
ابن محمد بن جابر بن عبداللہ انصاری ہروی۔

بعض لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری ولی کامل تھے،
اور کابل میں مدفون ہیں، اور ان کی قبر ان اطراف میں معروف ہے، اور رسالہ "مقامات"
میں خواجہ بہاء الدین نقشبند نے جابر بن عبداللہ انصاری کو "قطب" کے وصف سے
یاد کیا ہے، اسی پہلو سے شجرۂ نسب میں جابر کو "مقرب باری" کے وصف کے
ساتھ لکھا جاتا ہے۔"

"قرۃ الابصار" کے مصنف نے ایک اور مخطوطے کا حوالہ دیا ہے، جو راقم الحروف کو
ہنوز دستیاب نہیں ہوا ہے، یعنی "جواہر فریدیہ" جو حضرت بابا فرید گنج شکر کا ملفوظ ہے،
اس کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف "قرۃ الابصار" نے لکھا ہے۔

"جواہر فریدیہ میں ہے کہ (حضرت بابا صاحبؒ نے) حضرت عبداللہ انصاری
ہروی کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نسل سے ایک گروہ لکھنؤ میں رہتا
ہے، لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ہمارے قبیلے کے سوا (اجداد علمائے فرنگی محل کے سوا)
شیخ الاسلام ہرویؒ کی ذریت میں اور کوئی نہیں ہے۔"

بہر حال شیخ الاسلام کی پسری نسل کے سلسلہ میں اس ضمنی گفتگو کے بعد ہمیں اس
شخصیت کا ذکر کرنا ہے، جو اس وجہ سے تاریخ کی روشنی میں پوری طرح دکھائی دینے والی
شخصیت ہے کہ اس کے نام، شہنشاہ اکبر کا فرمان آج بھی موجود ہے، اس شخصیت کا نام
محمد حافظ ہے، جو درۃ نسب میں پانچویں نمبر پر ہیں،

---

۵ قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

علمائے فرنگی محل کے قریبی اجداد کا لکھنؤ سے پہلے وطن و مسکن قصبہ سہالی تھا، جو ضلع
بارہ بنکی (اودھ) میں اسی نام سے اب بھی موجود ہے، اب ضلع کی تحصیل فتحپور کے مواضعات
میں اس کا شمار ہوتا ہے، لکھنؤ سے پختہ سڑک جو بارہ بنکی شہر جاتی ہے، اس پر واقع بارہ بنکی
روڈویز بس اسٹیشن سے دیوہ فتحپور سڑک پر پندرہ کیلو میٹر جانے کے بعد کچے راستہ سے
مزید پانچ کیلو میٹر آگے سہالی واقع ہے۔ جو اب صرف ایک موضع کی حیثیت رکھتا ہے،
"سہالی" نام بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ جو تغلق سلطنت کے زمانہ (تیرہویں صدی عیسوی)
سے تحریروں میں ملتا ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (م ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء) کے ملفوظ خیر المجالس میں جسے
پروفیسر خلیق احمد نظامی (صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) نے ایڈٹ کیا ہے، ایک
مقام کے مشکوک نام کو اپنی تصحیح کے مطابق "سہالی" بتایا ہے، سہالی کے تعلق سے ملفوظ میں
جو ذکر ہے، وہ سہالی کے ماضی قریب سے مطابقت بھی رکھتا ہے، ملفوظ میں ہے:

"ایک عالم (حضرت چراغ دہلیؒ کی) خدمت میں آیا، حضرت نے پوچھا
کہاں سے آنا ہوا؟ اس نے کہا حضور کے غلاموں میں ہوں، سہالی نامی دیہات
سے آیا ہوں،

حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا: دیہات سہالی کے مرد باشندے دین دار ہیں
اور اکثر یہیں سے تعلق (بیعت کا)، رکھتے ہیں، وہاں کی عورتیں بھی یہیں سے (بیعت کا)
تعلق رکھتی ہیں، یہ عورتیں اپنے یہاں کے مردوں سے بھی زیادہ دیندار ہیں،

بندہ (مرتب ملفوظ مولانا حمید قلندر) نے عرض کیا، ان لوگوں میں دینداری
کی شان اور صلاحیت آپ ہی کے مرید ہونے کی بدولت ہے،

حضرت نے سہالوی عالم سے دریافت فرمایا: مشغلہ کیا ہے؟ عرض کیا بچوں کو پڑھاتا ہوں، فرمایا: بہت نیک کام ہے، معصوم بچوں میں اور قرآن پاک کی تعلیم میں مشغول رہنا، مزید براں بچوں کو قرآن پڑھانے کا کام مسجد میں ہوتا ہے، اور ہر وقت باوضو رہنا ہوتا ہے، بہترین مشغلہ ہے یہ اور بڑی اچھی مشغولیت ہے تعلیم قرآن میں۔"[1]

حضرت چراغ دہلیؒ اودھ کے رہنے والے تھے، اور اس خطے سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، سہالی بھی اسی خطے کا ایک حصہ ہے، اس سے ایک سراغ یہ بھی ملتا ہے کہ سہالی اس وقت بھی تعلیم و تعلم اور دین داری و پرہیزگاری میں تاریخی مقام حاصل کر چکا تھا، یعنی آٹھویں صدی ہجری (یا چودھویں صدی عیسوی) میں اس کا علمی اور دینی کردار اس درجہ متعارف ہو چکا تھا کہ حضرت چراغ دہلیؒ نے وہاں کے باشندوں کی اس نہج سے تعریف کی،

رہا یہ سوال کہ علمائے فرنگی محل کے اجداد میں کون صاحب سب سے پہلے سہالی میں سکونت پذیر ہوئے، تو قدیم خاندانی تذکرے اس کے جواب میں متفق نہیں ہیں، سب سے قدیم خاندانی مورخ ملا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی کا بیان ہے:

شیخ علاء الدین در سہالی وطن گرفتند[2]

شیخ علاء الدین نے (ورقۂ نسب میں دسویں نمبر پر) سہالی میں سکونت اختیار کی،

یہی خیال ان کے ساٹھ برس کے بعد تذکرہ لکھنے والے رضی الدین محمود فتحپوری کا بھی ہے:

شیخ علاء الدین ..... رفتہ رفتہ در

شیخ علاء الدین ..... رفتہ رفتہ سہالی

[1] خیر المجالس مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، شایع کردہ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۰۲، [2] رسالۂ قطبیہ (فارسی مخطوطہ)

قصبۂ سہالی رسیدہ آں مقام را خوش کردند و اقامت در آنجا گرفتند، چنانچہ اولاد ایشاں در سہالی سکونت گرفتہ آباداں شدند[1]

آئے، اور یہ جگہ ان کو پسند آگئی، اور اقامت اختیار کرلی، چنانچہ ان کی اولاد سہالی میں آباد ہو گئی،

رضی الدین محمود کے معاصر، اور تذکرہ لکھنے میں ہمعصر مولانا ولی اللہ فرنگی محلی، شیخ علاء الدین کے بیٹے شیخ نظام الدین کو سہالی میں سب سے پہلے سکونت پذیر ہونے والا قرار دیتے ہیں[2]

مولانا ولی اللہؒ کی اتباع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے کی، جنہوں نے اغصان اربعہ کی تصنیف کے سو برس بعد تذکرۂ علمائے فرنگی محل تصنیف کیا تھا،[3]

رضی الدین محمود، شیخ علاء الدین کو سہالی میں سب سے پہلے سکونت اختیار کرنے والا قرار دینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کا بیان ہے کہ شیخ علاء الدین کے بیٹے نظام الدین

تولد و نشو و نما در قصبۂ سہالی یافتند[4]

مولوی نظام بن شیخ علاء الدین سہالی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی،

چونکہ شیخ علاء الدین کے مزار کا سراغ سہالی میں نہیں ملتا، اور ان کے بیٹے نظام الدین کا مزار سہالی کی قدیم آبادی سے قدرے فاصلے پر پایا جاتا ہے، اور ان کے مدفن کو ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ کے پیش نظر احتراماً "روضہ" کہا جانے لگا تھا، اب تو اس بستی ہی کا نام روضہ ہو گیا ہے، اس لیے شاید شیخ علاء الدین نے سہالی میں سکونت پذیر ہوجا

[1] اغصان الانساب (فارسی مخطوطہ)، [2] اغصان اربعہ مطبوعہ ص ۳، [3] تذکرۂ علمائے فرنگی محل مطبوعہ ص ۸: [4] اغصان الانساب مذکورۂ بالا،

کا دعویٰ کرنے میں بعض مورخین تامل سے کام لینے پر مجبور ہو گئے، مگر قرۃ الابصار کے
مصنف مولانا عبدالباقی فرنگی محلی نے محض قبر کا سراغ نہ ملنے کو اتنی اہمیت نہیں دی
وہ اس عام حقیقت کے پیش نظر کہ قبریں بن کر محو بھی ہو جایا کرتی ہیں، اس سوال پر کہ پھر
علاءالدین کی قبر کہاں ہے؟ بتایا جائے، یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

در عالم محو چنانکہ آثار تربت شیخ
حافظ و پسران وے کہ قبرش بچشم
خود دیدیم، واکنوں آں جا زراعت
می شود، ہیچ قبر پیدا نیست، [1]

شیخ علاءالدین کی قبر اس طرح مٹ
گئی جس طرح شیخ حافظ کی تربت
کے اور ان کے بیٹوں کی قبروں کے
آثار مٹ گئے، حالانکہ شیخ حافظ
اور انکے بیٹوں کی قبریں خود ہم نے
دیکھی تھیں، اب اس جگہ کھیتی ہوتی
ہے، کسی قبر کا بھی وہاں نشان باقی نہیں ہے،

تو اگر محض قبر کے ناپید ہو جانے سے اس کے مدفون کی اس سرزمین میں سکونت سے انکار
کر دینا جائز ہے، تو شیخ حافظ کے بھی ساکن سہالی ہونے سے انکار کیوں نہ کر دیا جائے، جب
کہ ان کی تربت بھی معدوم ہو چکی ہے، لیکن شیخ حافظ بلاشبہ باشندۂ سہالی تھے، اس لیے
کہ ان کا سہالوی ہونا ثبوت واقعی رکھتا ہے،

یہ ثبوت واقعی ان کے نام شہنشاہ اکبر کے فرمان کی اصل دستاویز کی شکل میں آج
بھی موجود ہے،

شہنشاہ اکبر کا یہ فرمان علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر روشنی ڈالنے کے علاوہ

---

[1] قرۃ الابصار (مخطوطہ فارسی) مذکورہ بالا

ایک اور تاریخی اہمیت بلکہ ندرت کا بھی حامل ہے، اس فرمان کی موجودگی نے علمائے فرنگی محل
کے شجرۂ نسب کو قیاسات تاریخیہ کے دائرے سے نکال کر تاریخ کی کھلی روشنی میں لا کر رکھدیا ہے،
خاندان کے تذکرہ نگاروں میں سے ہر ایک نے رسالہ قطبیہ، اغصان اربعہ، آثار الاول،
اغصان الانساب، قرۃ الابصار، اور تذکرۂ علمائے فرنگی محل کے مصنفین میں سے ہر ایک نے
اکبری فرمان کا بس اس قدر حوالہ دیا ہے کہ وہ شیخ حافظ کے نام تھا اور اب بھی موجود ہے،
لیکن اس کا متن کسی نے نقل نہیں کیا تھا،

قرۃ الابصار کے مصنف مولانا عبدالباقی فرنگی محلی پہلے مصنف معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے
اپنی عربی تصنیف "برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل" میں فرمان کا متن پورا پورا
نقل کیا ہے،

جس زمانے میں یہ فرمان جاری ہوا، اس وقت تک سلطنت مغلیہ میں فرامین کے نستعلیق
خط میں لکھنے کا آغاز نہیں ہوا تھا، اگرچہ نستعلیق خط میں فرامین کی تحریر عہد اکبری ہی میں شروع
ہو گئی تھی، نستعلیق سے پہلے فرامین کا خط "خط سجلات" ہوا کرتا تھا، وہ خط جس کا لکھنے والا
سطر کے شروع میں کاغذ پر قلم رکھتا تو تا ختم سطر اٹھاتا نہ تھا، اس طرح کی تحریر میں کسی ایک
حرف کے بھی اضافے کا امکان نہیں رہتا تھا، فرامین میں جعل بنانے کا تصور بھی اس تحریر
کے سلسلہ میں نہیں کیا جا سکتا ہے،

راقم الحروف کے پاس اس فرمان کا عکس ہے، مگر اس کے رسم خط سے یکسر نابلد ہونے
کی وجہ سے اس کا ایک لفظ بھی پڑھنا ممکن نہ ہوا، سب سے پہلے اس عکس کو پروفیسر عرفان حبیب
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے پڑھ کر اور نستعلیق خط میں اسے لکھ کر راقم الحروف کو دیا، اس
کے بعد برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل (عربی مخطوطہ) کا عکس دستیاب ہوا

جس میں پروفیسر عرفان حبیب کی صاف لکھی عبارت کے عین مطابق فرمان کا متن نقل ہوا ہے۔ اکبری مہر کے فرمان کا متن حسب ذیل ہے:

مہر

ھوالغنی

فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

دریں وقت فرمان عالی شان واجب الاذعان شرف صدور یافت کہ موازی دو ہزار و شش صد بیگھہ از مواضع و محال مفصلۂ ضمن در پرگنۂ فتح پور من اعمال سرکار لکھنوو کہ مقبوضۂ فضیلت مآب شریعت آئین تقوی شعار صلاح آثار شیخ حافظ مدرس ولد فضل اللہ و قاضی فتح اللہ قاضی قصبۂ سہالی ولد قاضی شہر اللہ و جماعہ مذکورہ فی الضمن است بہمان دستور بمشار الیہما و جماعہ متعلق باشد کہ وجہ آں را بشرط قبض و عمل قدیم سال بسال بمدد معاش خود متصرف شدہ بمہمات خود قیام نمایند حکام کرام و متصدیان عظام و عمال مباشران امور و اشغال منوال سرکار مذکور خصوصاً جائے گیرداراں و عاملان پرگنہ مذکورہ می باید کہ حسب المسطور مقرر دانستہ تغیر و تبدل بقواعد آن راہ ندہند و بعلت مال و جہات و اخراجات و عوارضات چوں قنلغہ و داروغگانہ و محررانہ و ضابطانہ و جریبانہ و صدہ دہی و قانون گوئی و دیگر ارنداعت و پیشکش و ساوری و کل تکالیف دیوانی و وجوہات سلطانی مزاحمت بحال فضیلت آئین مشار الیہما و جماعہ ضمن و مزارعان ایشان نہ رسانند و من کل اموالات و جمیع المطالبات معاف و مسلم و مرفوع القلم شناختہ مطلقاً پیرامون نہ گردند و ہیچ وجہ من الوجوہ طمع و توقع نہ کنند در عہدہ دانستہ از فرمودہ در نہ گردند و ہر سال در

باب فرمان و پروانچہ مجدد طلب نہ دارند تحریراً فی التاریخ غرۂ شہر ربیع الاول سنہ ۹۶۷ھ

اس فرمان اکبری کی تواریخی اہمیت اس پہلو سے ہے، جیسا کہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ مسلم یونیورسٹی آخر دسمبر ۱۹۷۵ء میں متفقہ طور سے تسلیم کیا ہے، کہ اکبر کے اولین فرمانوں سے ایک یہ ہے، جس تاریخ کو یکم ربیع الاول ۹۶۷ھ مطابق یکم دسمبر ۱۵۵۹ء اس کا اجرا ہوا، اس سے پہلے کی تاریخ کا کوئی اکبری فرمان ابھی تک تاریخ مغلیہ کے ماہروں اور محققوں کو دستیاب نہیں ہوا ہے، اس لیے اس فرمان کو اکبر کا اولین فرمان مانا جاسکتا ہے، جو اس نے تخت نشین ہونے کے صرف تین برس چار مہینے کے بعد جاری کیا، اس وقت شہنشاہ اکبر کی عمر سترہ سال کی تھی، اور اپنے اتالیق، سرپرست اور امور سلطنت کے تمام تر ذمہ دار خان خاناں بیرم خاں کے اقتدار سے آزاد ہوئے سال ڈیڑھ سال گذرا تھا۔

فرمان میں دو جگہ املا، آج کے املا سے مختلف ہے۔ "لکھنؤ" کو دو واؤ کے ساتھ "لکھنوو" لکھا گیا، اور جاگیرداراں کو "جائے گیرداراں" لکھا گیا۔

فرمان کی فارسی عبارت کا اردو میں خلاصہ یہ ہے:

"ان مواضع اور محالات میں جو سرکار لکھنؤ کے پرگنہ فتحپور میں واقع ہیں، اور جن کی صراحت فرمان کے پشت پر مرقوم ہے، دو ہزار چھ سو بگھہ، فضیلت مآب، شریعت آیات، تقوی شعار اور صلاح آثار شیخ حافظ مدرس ولد فضل اللہ اور قاضی فتح اللہ قاضی قصبۂ سہالی ولد قاضی شہر اللہ اور ان لوگوں کے جن کے ناموں کی صراحت فرمان کے پشت پر ہے، بدستور قبضے میں رہیں گے، اور اس اراضی کی آمدنی سے بدستور اپنی گزر کرتے اور اپنے فرائض بدستور ادا کرتے رہیں گے،

حکام متعلقہ کو لازم ہے کہ اس قدیم قبضے میں کسی قسم کا تغیر و تبدل روا نہ رکھیں،

اور کسی لگانی یا مالی سبب سے (فرمان میں مذکور) ٹیکسوں کی زحمت ان حضرات کو نہ دیں، نہ ان کے کاشتکاروں کو زحمت دیں، ہر قسم کے ٹیکس اور سرکاری مطالبے سے اس آراضی کو معاف سمجھیں، اور سال بہ سال فرمان کی تجدید کی سند نہ مانگیں"۔

اس فرمان میں ایک درجن سے زیادہ ٹیکسوں کے نام آئے ہیں، اور ان سب ٹیکسوں سے مدد معاش میں دی جانے والی دو ہزار چھ سو بیگھہ آراضی کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ عہد مغلیہ میں آراضی پر کیا کیا ٹیکس از روئے ضابطہ لگا کرتے تھے،

مال وجہات:- آراضی کا لگان، اور اس کے متعلق ٹیکس،

اخراجات:- تحصیل وصول کے مصارف جو کاشتکاروں سے لیے جاتے تھے،

تلفہ:- ہدیہ یا تحفہ جو حکام کو پیش کیا جاتا تھا،

داروغگانہ:- داروغہ کی فیس،

محترفہ:- دستکاروں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا تھا،

مہرانہ:- قاضی کے مہر لگانے کی فیس جو کسی سند پر اس کے مستند ہونے کے لیے لگائی جاتی تھی،

ضابطانہ:- زمین کی پیمائش کرنے والی جماعت کی فیس،

جریبانہ:- ناپنے کی فیس،

صدد وئی، قانون گوئی:- قانون گوئی کے لیے لگان پر ڈھائی فی صدی کا ٹیکس،

تکرار زراعت:- آراضی قابل کاشت پر کھیتی نہ کرنے کا جرمانہ،

پیش کش:- نذرانہ،

سادرسی:- مویشیوں کا ٹیکس،

ایسے القاب و آداب کے ساتھ شیخ حافظ مدرس مدد، فتح اللہ قاضی کا فرمان میں ذکر

بھی قابل لحاظ ہے، جب کہ اس عہد میں عموماً ایک لقب یا ایک احترامی لفظ سے فرمان پانے والے کا نام لکھا جاتا تھا، پھر اتنی بڑی آراضی دو ہزار چھ سو بیگھہ کا فرمان تو اس زمانے میں جاری ہی نہیں ہوا کرتا تھا اس سے زیادہ اہم یہ کہ مدد معاش کی آراضی کو ہر قسم کے آراضی ٹیکس سے اس طرح چھوٹ بھی نہیں دی جاتی تھی، اگر چھوٹ دی جاتی تو بعض ٹیکسوں سے،

فرمان کی ضمن (پشت) کا عکس دستیاب نہیں ہے، کاغذ کو مضبوط و محفوظ بنانے کے خیال سے نہ معلوم کب اس کی پشت کو دبیز کاغذ سے منڈھ دیا گیا تھا، جس کا اب الگ کرنا اصل فرمان کے لیے ضرر کا سبب بن سکتا ہے، افسوس یہ ہے کہ ضمن میں مندرج ناموں کے نہ معلوم ہو سکنے سے خاندانی تاریخ کی ایک کڑی بیچ سے غائب ہو گئی،

جہاں تک فرمان کے متن میں مذکور دوسرے نام قاضی فتح اللہ ولد قاضی شہر اللہ کا معاملہ ہے، ان کے حالات بھی کہیں سے دستیاب نہ ہو سکے، فرمان کے متن میں انہیں "قاضی سہالی" سے یاد کیا گیا ہے، سہالی میں قاضیوں کا ایک خاندان ابھی تک موجود ہے، اس خاندان میں قضا (عدالت) کئی پشتوں سے چلی آتی ہے، اب اگرچہ امور عدالت سے کوئی تعلق افراد خاندان کا نہیں ہے، مگر "قاضی" ان کے ناموں کا جزو اب تک ہے، یہ خاندان بھی نسلاً انصاری ہے، علمائے فرنگی محل کے شجرے سے اس قاضی خاندان کا اتصال شیخ حافظ مدرس پر ہوتا ہے، برکتہ الباری فی سلالۃ ملا حافظ الانصاری (عربی مخطوطہ) سے پتہ چلتا ہے، پھر بھی قاضی فتح اللہ کا معاملہ صاف نہیں ہوتا،[1]

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ حافظ، جو فرمان جاری ہونے کے وقت مدرس کی حیثیت سے مشہور و معروف ہو چکے ہیں، عہد اکبری کے ابتدائی دور میں ایک ممتاز شخصیت

---

[1] سلالۃ ملا حافظ الانصاری مصنفہ مولانا عبدالباقی فرنگی محلی (عربی مخطوطہ)

کے مالک تھے،

شیخ حافظ مدرس کے ذکر میں ہر تذکرہ نگار اور ہر مؤرخ نے ان کے نام فرمانِ اکبری کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے، جیسے ان کے علم و فضل کی شہرت بڑھتے بڑھتے شہنشاہ اکبر تک پہنچی، اور اس نے ان کے علم و فضل کے اعتراف کے طور پر یہ اتنا وسیع رقبہ ان کی اولاد و متعلقہ اشخاص کی مدد معاش میں دے دیا،

علامہ شبلی نعمانی (م سنہ ۱۹۱۴ء) نے تو اپنے مقالہ "درسِ نظامی" میں صراحت سے لکھ دیا کہ

"شیخ حافظ نے علم و عمل میں زیادہ شہرت حاصل کی، یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا، تیموری حکومت کی یہ خصوصیت اس کے کارناموں کا طغرائے زریں ہے کہ چپہ چپہ پر واقعہ نویس موجود تھے، جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ اربابِ کمال کے وجود سے بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے، چنانچہ خبر پہنچنے کے ساتھ ان لوگوں کی جاگیریں مقرر ہو جاتی تھیں..... شیخ حافظ کی بھی جاگیر مقرر ہوئی"[1]

حالانکہ اکبر کے فرمان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، کہ اکبر کو شیخ حافظ کے علم و فضل کا علم ہوا، اور اس نے مدد معاش کا فرمان جاری کر دیا، بلکہ یہ مدد معاش اکبر کے بالکل ابتدائی عہد میں بھی مدد معاش پانے والوں کے قبضے میں تھی، اکبر نے صرف اس کی توثیق کی یہ جملے کہ "بدستور قبضے میں رہے گا" اور "قدیم دستور کے مطابق .... اپنی گزر بسر میں اور اپنے فرائض میں مشغول رہیں" بتا رہے ہیں کہ قدیم سے یہ مدد معاش ان حضرات کے پاس تھی،

اکبر کے عہد سے کس قدر پہلے سے یہ مدد معاش ان حضرات کے پاس تھی؟ اس کا کوئی

---

[1] مقالہ علامہ شبلی بعنوان "درس نظامیہ" مطبوعہ سنہ ۱۹۱۰ء،

سراغ اب نہیں مل سکتا، پھر بھی یہ مانا جا سکتا ہے کہ ہمایوں سے بھی پہلے (۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء سے ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء تک) سے یہ جاری تھی، اس لئے کہ اگر بابر یا ہمایوں نے پہلے پہل اسے جاری کیا ہوتا تو مغل حکمرانوں کے عام رویے کے مطابق اکبر کے فرمان میں فخریہ طور پر اس کا حوالہ ضرور ہوتا،

پھر کیا سوری یا لودھی حکمرانوں میں سے کسی نے اول اول یہ مدد معاش جاری کی؟ کون بتائے اور کیسے! اتنا بہر حال سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ شیخ حافظ جو اکبر کے ابتدائی چار برسوں ہی میں "مدرس" کی حیثیت سے معروف اور مستند ہو چکے تھے، درس و تدریس کے شغل میں عمر کا خاصا حصہ صرف کر چکے ہوں گے، یعنی اکبر کی تخت نشینی کے وقت (۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء میں) نوجوانی یا جوانی کی سرحدوں کو پار کر چکے ہوں گے، اگر اندازاً اس وقت انہیں چالیس سال کی پختہ عمر کا بھی مان لیا جائے تو ان کی پیدائش کا زمانہ ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء تک بھگ قرار پاتا ہے، یعنی لودھی حکمرانوں میں سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) کی حکمرانی کے آخری سال میں،

شیخ حافظ مدرس کی (علمائے فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں پانچویں نمبر پر) نہ تاریخ وفات کہیں ملتی ہے نہ عمر کی صراحت، مگر اس سلسلہ میں ایک روایت پر بھی نظر ڈال لینا ضروری ہے، جو بادی النظر ہی میں غلط ٹھہر جاتی ہے، پھر بھی ایک مؤرخِ خاندان نے اس کو اپنے تذکرے میں بغیر کسی جرح کے جگہ دے دی ہے،

مولانا ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء) نے اغصان اربعہ میں، اور ان کی پیروی میں مولانا عبد الباقی فرنگی محلی (م ۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۵ء) نے "برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل" (عربی مخطوطہ) میں لکھا ہے کہ:-

"شیخ حافظؒ، مخدوم شیخ سارنگؒ کے ہمعصر تھے، اور دونوں میں بڑا اخلاص تھا، اور شیخ حافظ مخدوم سے ملنے اور مخدوم شیخ سارنگؒ ان سے ملنے آیا کرتے تھے اور قدیم حویلی (واقع سہالی) میں ایک پتھر موجود ہے، لوگوں کی زبانوں پر ہے کہ مخدوم شیخ سارنگؒ اور شیخ حافظؒ اسی پتھر پر پاس پاس بیٹھا کرتے تھے"۔[1]

مخدوم شیخ سارنگ اور شیخ حافظ کو ایسا معاصر تسلیم کر لینا کہ دونوں ہم سن یا قریب عمر کے ہوں سراسر خلاف قیاس ہے، مخدوم سارنگؒ نے ایک سو بیس (۱۲۰) برس کی عمر میں ۱۶ / شوال ۸۴۷ھ مطابق جنوری ۱۴۴۴ء میں انتقال کیا،[2]

شیخ سارنگ اپنے عنفوان شباب میں فیروز تغلق کے ممتاز درباری تھے، اور وہ "ملک سارنگ" کہلاتے تھے،[3] فیروز تغلق کا عہد ۷۵۱ھ / ۱۳۵۰ء سے ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء تک محیط ہے،

جب مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور ان کے بھائی مخدوم راجو قتالؒ کی توجہ ملک سارنگ سے مخدوم شیخ سارنگ ہوئے تو انہوں نے حج و زیارت کا سفر کیا، اس کے بعد لکھنؤ آئے، اور حاجی الحرمین حاجی قوام الدین لکھنوی سے عرفانی تربیت لے کر ضلع بارہ بنکی کے مجھگاواں بستی میں جو سہالی سے قریب ہی ہے بود و باش اختیار کر لی،[4]

اس وقت مخدوم شیخ سارنگؒ عمر کی آٹھ نو دہائیاں گذار چکے ہوں گے، اب اگر شیخ حافظ سہالوی سے اسی زمانے میں ان کا میل جول اور آنا جانا ہوا، تو شیخ حافظ

---

[1] اغصان اربعہ مطبوعہ ص۳ ، [2] فوائد سعدیہ (مخدوم شیخ سعد خیرآبادی متوفی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء کی تصنیف مجمع السلوک (مخطوطہ) کا انتخاب از قاضی ارتضیٰ علی خاں گوپاموی متوفی ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء) مجمع السلوک شیخ سعد خیرآبادی کا مرتب کردہ اپنے شیخ و مرشد مخدوم شاہ مینا لکھنوی متوفات ۸۸۴ھ / ۱۴۷۹ء کے ارشادات پر مشتمل ملفوظ ہے، [3] حوالۂ بالا، [4] ایضاً،

کی عمر اس وقت کیا ہونا چاہیئے؟ قیاس چاہتا ہے کہ اگر وہ مخدوم کے ہم سن نہ ہوں تو عمر کی چار پانچ دہائیاں تو گذار ہی چکے ہوں گے، ورنہ باہم مخلصانہ روابط کے کوئی معنی نہیں رہتے،

اب خیال کیا جائے کہ مخدوم شیخ سارنگؒ کی ۸۴۷ھ / ۱۴۴۴ء میں ایک سو بیس (۱۲۰) برس کی عمر میں وفات کے وقت شیخ حافظ کی عمر ایک سو بیس برس کی آدھی تو ہونا ہی چاہیئے، یعنی ساٹھ (۶۰) برس، اس پر ایک صدی گذرتی ہے تو ۹۴۷ھ میں شیخ حافظ ایک سو ساٹھ برس کے ہو جاتے ہیں، اور اس پر مزید دس سال گذرتے ہیں تو ۹۵۷ھ میں شہنشاہ اکبر ان کے نام فرمان صادر کرتا ہے، اس وقت وہ ایک سو ستر (۱۷۰) برس کے ہو چکے ہوتے ہیں، اگر فرمان صادر ہوتے ہی ان کو دنیا سے کوچ کرنے والا نہیں مانا جاتا، اور دس پانچ برس مہلت دی جاتی ہے تو شیخ حافظ کی عمر پونے دو سو برس سے تجاوز کر جاتی ہے — ایسی طویل العمری خارج از امکان نہ سہی، مگر اس کا وقوع پذیر ہونا تحریری سند اور حوالہ چاہتا ہے، ایسی نادر الوقوع عمر تاریخ کی نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی،

شیخ حافظ سہالوی نہ صرف عمر کے بارے میں مجہول الحال ہیں، بلکہ تاریخ وفات کے بارے میں بھی ان کا یہی حال ہے، مدفن قصبۂ سہالی میں تھا، جیسا کہ مصنف "قرۃ الابصار" نے بتایا ہے، اسی مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے مدفن کو اس نے خود دیکھا تھا مگر اس کے زمانے ہی میں وہ معدوم ہو گیا، اور اب اس زمین پر کاشت ہو رہی ہے، جیسا کہ اوپر اسی حوالہ سے گذر چکا ہے،

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا مذاکرۂ علمی

عربی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم

از ضیاء الدین اصلاحی

عربی مدارس کے نصاب و طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے لیے ندوۃ العلماء کی عظیم الشان تحریک اور خود دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تھا، اس دور میں بھی عربی مدارس کی افادیت کو باقی رکھنے کے لیے ان کے نصاب کا وقت اور عہد سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے، اس کے پیش نظر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اساتذہ کی دعوت پر وہاں ۲۸، ۲۹، فروری اور یکم مارچ ۸۴ء کو عربی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ ہوا، جس میں تقریباً ملک بھر کے مدارس کے نمائندوں نے شرکت کی،

پہلے روز ۹ بجے دن میں کتب خانہ ندوۃ العلماء کی جدید عمارت کا افتتاحی جلسہ اس کے وسیع ہال میں مولانا منت اللہ رحمانی ناظم امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کی صدارت میں ہوا، جس میں ندوہ کے علاوہ شہر کے معززین بھی بڑی تعداد میں شریک تھے، قاری ودود الحی صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی دلنشین تقریر سے جلسہ کا آغاز ہوا، ندوہ کی ابتدائی تاریخ کا ذکر آیا، تو وہ شدت تاثر سے آبدیدہ ہوگئے، کچھ دیر کے بعد پھر تقریر شروع کی، تو ان کی آواز گلوگیر تھی، کتب خانہ کی جدید عمارت علامہ شبلیؒ کے نام سے منسوب کی گئی ہے، مولانا نے بتایا کہ یہ تجویز ندوہ کے چودھویں اجلاس میں نواب علی حسن خاں صاحب نے پیش کی تھی، جس کی

تائید کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا "اس (مولانا شبلیؒ) نے اپنی تصنیفات سے دلوں کو روشن کیا ہے ہم یادگار کہاں بنائیں؟ دل میں، اس کا دل کہاں رہتا تھا؟ کتابوں میں! کتابوں کا گھر کہاں ہے؟ کتب خانہ! ہم کتبخانہ کی عمارت بناتے ہیں کہ وہ اسکی روح کا مسکن ہو، مسجدیں خدا کا گھر ہیں، کیا خدا کی روح وہاں رہتی ہے؟ نہیں! اس کی محبت وہاں رہتی ہے، ہمارا کتب خانہ بھی اسی کی محبت کا گھر ہوگا، اللہ نے ادارے کے موجودہ خادموں کو بزرگوں کی تمنائیں پوری کرنے کی توفیق دی ہم بے وفا اور احسان فراموش نہیں ہیں،

مولوی نذر الحفیظ ندوی نے علامہ شبلی اور کتب خانہ" کے موضوع پر، اور مولانا مرتضیٰ صاحب ناظر کتب خانہ نے "کتبخانہ ندوۃ العلماء، منزل بمنزل" کے عنوان سے مقالے پیش کیے، متحدہ عرب امارات کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے نمائندہ ڈاکٹر محمد المہدی البدری کی عربی تقریر کا خلاصہ اسی وقت مولوی سلمان ندوی نے پیش کیا، صدر جلسہ اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین نے بھی خطاب کیا، اور صدر کی دعا پر یہ جلسہ ختم ہوا، ناظم ندوۃ العلماء نے نئی کتاب تاریخ ندوہ کے دونوں حصے مولانا منت اللہ رحمانی کو پیش کیے،

اسی روز مغرب بعد مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی نئی عمارت کا جلسہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین کی صدارت میں ہوا، مجلس کے رفقا، مولانا شمس تبریز خاں، اور مولوی عتیق احمد قاسمی نے مقالات پڑھے، جناب صدر نے فرمایا "ندوہ کے بزرگوں نے علم کے پھولوں کا رس چوس چوس کر علم کے شہد کا انبار لگا دیا ہے، امید ہے کہ علوم کا آبشار پہلے کی طرح آیندہ بھی بہتا رہیگا، اور ندوے کی آیندہ نسل لکھنے ہوئے ورقوں کو بحال کریگی، انھوں نے موجودہ دور میں تحقیقی معیار کی پستی اور اصحاب علم کی تن آسانی پر افسوس ظاہر کیا، انکی تقریر ادبی رعنائی و لطافت سے معمور تھی،

دوسرے روز ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی امیر تاج المساجد بھوپال کی صدارت میں مذاکرہ شروع ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں نصاب تعلیم کو شرح

زندگی، ضمیر اور دعوت کا تذکرہ ہوا، انہوں نے نصاب میں اصلاح و تبدیلی کی ضرورت واضح کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ کام رواروی میں نہیں کیا جا سکتا، ندوۃ العلماء کے استاذوں مولانا ابو العرفان ندوی، مولانا محمد رابع ندوی، مولوی نور عظیم ندوی اور مولوی نذر الحفیظ ندوی نے اسی اجلاس میں مقالات پڑھے، مذاکرہ کے تیسرے اجلاس میں مولانا منت اللہ رحمانی، ڈاکٹر عبد الحفیظ سلفی، ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولوی سلمان حسنی ندوی، ڈاکٹر غیاث الدین ندوی، مولوی سجاد حسین ندوی، مولوی ابو سحبان ندوی، مولوی ابو العاص بستوی نے مقالات پڑھے، راقم الحروف نے دوسرے اجلاس میں "عربی مدارس اور انکا نصاب تعلیم" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، مولانا ابو البقا ندوی دار المصنفین کے کاموں میں اس قدر منہمک رہے کہ اپنا مضمون "علامہ شبلی اور اصلاح نصاب" نہیں پڑھ سکے، ڈاکٹر مولانا عبد اللہ عباس ندوی اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی وغیرہ نے اپنے خیالات وقتاً فوقتاً زبانی پیش کیے۔

آخری اجلاس میں جو تجویزیں منظور کی گئیں، ان میں مدارس عربیہ کو ہندوستان میں اسلام کے تحفظ کی ضمانت اور ان کے مقاصد اور کردار کے تحفظ کو مسلمانوں کا ملی فریضہ بتا کر ان پر زور دیا گیا کہ وہ ایسے علما پیدا کریں جو داعیانہ جذبہ، مضبوط کردار اور تفقہ فی الدین کے حامل اور اپنے عہد کے افکار سے واقف ہوں، اس کیلئے ایسا جامع نصاب مرتب کیے جانے کی سفارش کی گئی جس میں مدارس کے بنیادی اغراض اور موجودہ عہد کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علوم مقصودہ کو خاص اہمیت دی جائے، ایک مستقل کمیٹی کی تشکیل کیے جانے کے لیے مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی اور ڈاکٹر عبد الحفیظ سلفی بنیادی رکن مقرر کیے گئے۔

خدا کرے یہ اجتماع مدارس کی تاریخ میں ایسے انقلاب کا پیش خیمہ ہو جو قوم و ملت کیلئے مفید اور موجب خیر و برکت ہو، تینوں روز ندوۃ العلماء میں بڑی چہل پہل رہی، مولانا محمد رابع ندوی، مولوی نور عظیم ندوی، مولوی نذر الحفیظ ندوی اور مولوی سید کمال حسینی ندوی اجلاس کی کامیابی کیلئے ہر وقت سرگرم عمل نظر آئے، مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم، مولانا ابو العرفان ندوی اور مولانا محمد واضح ندوی بھی ہر موقع پر پیش پیش رہے، اور مولانا علی میاں کی دعا و برکت سے ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پاتا رہا، طلبہ کی انجمنوں، النادی العربی اور جمعیۃ الاصلاح نے بھی مہمانوں کا خیر مقدم کیا، انکی اردو اور عربی تقریروں نے

وفیات

جناب سعید انصاری مرحوم

از ضیاء الدین اصلاحی

قارئین معارف کو گذشتہ شمارہ سے جناب سعید انصاری کے انتقال کی خبر معلوم ہو چکی ہے انکا وطن اعظم گڈھ ہی تھا، اپنے محلہ اور شہر کے قدیم مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مشن اسکول میں داخلہ لیا، یہ بڑا پر آشوب دور تھا ملک کے گوشہ گوشہ میں خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کے اثر سے انگریزوں کے خلاف ہیجان برپا تھا،

تحریک کے پروگرام میں سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی تھا، سعید انصاری صاحب نے اس سے متاثر ہو کر اسکول چھوڑ دیا اور بنارس جا کر کاشی ودیا پیٹھ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا، انٹرمیجیٹ میں بارہ روپیہ ماہوار وظیفہ ملا مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کشش انھیں علی گڑھ کھینچ لائی، ۱۹۲۴ء میں وہ طلبہ کی انجمن اتحاد کے سکریٹری اور ان کے ہم سبق ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم نائب صدر ہوئے، ۱۹۲۵ء میں بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۶ء میں جامعہ میں استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اس زمانہ میں اس کی مالی حالت نہایت خراب تھی کئی کئی مہینے تک استادوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں جامعہ کے امناد ٹرسٹیز اسے بند کر دینے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے مگر انجمن تعلیم ملی کے ارکان نے بیس برس تک جامعہ کی خدمت کرتے رہنے اور ڈیڑھ سو سے زیادہ مشاہرہ نہ لینے کا عہد کیا تھا، ابتدا میں گیارہ استاد اسکے حیاتی رکن تھے جن میں سعید انصاری مرحوم بھی تھے۔

وہ اپنی علمی و تعلیمی استعداد بڑھانے کیلئے پہلے شانتی نکیتن گئے پھر ۱۹۳۳ء میں امریکہ گئے اور

کولمبیا یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ان کی واپسی کے بعد جامعہ میں ٹریننگ کالج (استادوں کا مدرسہ) قائم ہوا جس کے یہ پرنسپل مقرر کئے گئے، انھوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور کفایت شعاری سے اس مدرسہ کو خود کفیل بنا دیا تھا۔

ہری پورہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی اور ذاکر صاحب کی "قومی بنیادی تعلیم" کی اسکیم منظور ہوئی تو اسے جامعہ کے استادوں کے مدرسہ میں رائج کیا گیا، سعید انصاری صاحب نے اسکیم کو چلانے اور کامیاب بنانے میں سرگرم حصہ لیا، ذاکر صاحب نے ثانوی مدرسہ کے لئے انفرادی طریقۂ تعلیم رائج کرنے کی تجویز سوچی تو ان کی تعلیمی مہارت اور دلچسپی کی وجہ سے یہ کام بھی انہی کے ذمہ کیا جس کو انھوں نے محنت، کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

تصنیف و تالیف سے بھی انھیں دلچسپی تھی، جامعہ میں اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا تو وہ رفیق کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہوئے طالب علمی کے زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں صاحب کے اشتراک سے ایک قلمی رسالہ "الرشید" کے نام سے نکالا، بعد میں انھوں نے اس کا نام بدل کر مولانا محمد علی کے تخلص کی نسبت سے جوہر کر دیا اپریل ۲۶ء میں پیام تعلیم کا اجرا ہوا چند ماہ بعد اسکی ادارت سعید انصاری صاحب کو تفویض کی گئی کچھ دنوں تک مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کے ادارۂ تحریر میں بھی شریک رہے، ابتدا میں معارف کیلئے بھی انھوں نے بعض انگریزی مضامین کے ترجمے کئے، رسالہ جامعہ کے تو وہ خاص مضمون نگار تھے الناظر لکھنؤ میں بھی انکے مضامین شائع ہوئے بلکہ اسی کے ایک مضمون سے انکی علمی شہرت کا آغاز ہوا، اس کے اڈیٹر مولانا ظفر الملک علوی نے اردو کے عناصر اربعہ پر ایک کل ہند انعامی مقابلہ کا اعلان کیا جسمیں مختلف اہل قلم نے حصہ لیا، یہ اسوقت بی۔ اے کے طالب علم تھے مگر انکا مضمون "مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز" انعام کا مستحق قرار دیا گیا جو رسالہ میں چھپنے کے علاوہ اسی زمانہ میں کتابی صورت میں مولانا عبد الماجد دریابادی کے دیباچہ کے ساتھ بھی شائع ہوا۔

انکا اصلی موضوع تعلیم اور اسکی تاریخ تھا، اس پر اور بچوں کے موضوعات پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جنکے نام

یہ ہیں، (۱) بچوں کی نظمیں (۲) بچوں کے اسماعیل (۳) بھولا بچہ (۴) ایک بچہ کی کہانی (۵) تعلیم و سماج (۶) ہندوستانی تعلیم کے مسائل (۷) زندگی کا رخ (۸) اکابر تعلیم (۹) گاندھی جی کے تعلیمی خیالات۔

طالب علمی کے زمانہ میں انھوں نے ٹیگور کے ایک رسالہ کا "ہندوستانی تعلیم کا مرکز" کے نام سے اردو ترجمہ کیا پھر جان اسٹوورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا "آزادی" کے نام سے ترجمہ شائع کیا، حال میں ترقی اردو بورڈ نے ان سے دو کتابوں کے ترجمے کرائے ایک "تعلیم ہندوستان کے اسلامی عہد میں" اور دوسری "عصری تعلیم"۔

دار المصنفین سے ان کا تعلق بہت پرانا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے زمانے سے ابتک کے ہر ہر فرد سے حسب حیثیت ان کے تعلقات تھے اور جب بھی وطن آتے تو دار المصنفین ضرور آتے اس معمول میں زندگی بھر کوئی فرق نہیں آنے دیا حضرت سید صاحب کے دور ہی میں وہ اسکی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہو گئے تھے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ندوۃ العلماء سے بھی انھوں نے ہمیشہ اخلاص و ہمدردی کا تعلق قائم رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے بھی ممبر تھے۔

وہ ہمیشہ قوم پرور اور ملک کی آزادی کی تحریک سے وابستہ رہے، ان کی ابتدا خلافت اور نان کوآپریشن تحریک سے ہوئی تھی، اسی زمانہ سے کھدر پہننے لگے تھے، جسے آخر تک نہ چھوڑا۔

دین و مذہب سے غیر معمولی شغف تھا انھیں موجودہ جامعہ سے یہ شکایت تھی کہ وہ اپنی اصل خصوصیات اور دینی کردار سے منحرف ہو گئی ہے آخر عمر میں انھوں نے جامعہ کی خوبصورت مسجد تعمیر کرائی اور اپنے مکان میں ایک نرسری اسکول کھولا، ان صدقات جاریہ کا ثواب انھیں ہمیشہ ملتا رہے گا۔

بڑے سادگی پسند اور کفایت شعار تھے ان میں نمود و نمائش اور ظاہر داری نہ تھی، انکی نظر لوگوں کی خامیوں پر زیادہ پڑتی تھی اور اسکا وہ صفائی اور بے تکلفی سے اظہار بھی کر دیتے تھے جو لوگ انکی افتاد طبع سے واقف نہ تھے وہ انکی فقرے بازی کا برا مان جاتے مگر انہیں کینہ کپٹ نہ تھا وہ ہمیشہ تندرست رہے اور بیمار بہت کم ہوئے اسی برس سے متجاوز ہونے کے باوجود ضعف اور بڑھاپے کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا مگر دفعتہً معلوم ہوا کہ انکی آنتوں میں کینسر ہو گیا ہے، بیماری کے زمانہ میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب سے ملنے کے بہت آرزومند تھے، مولانا سے تو ملاقات ہو گئی مگر سید صباح الدین صاحب سے ملاقات کی تمنا پوری نہیں ہو سکی انھوں نے قابل رشک موت پائی دو ماہ تک مرض کی شدتوں کا صبر سے مقابلہ کرنے کے بعد خندہ روئی سے موت کا خیر مقدم کیا۔ ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

مطبوعات جدیدہ

تجلیات قرآن کے چند عجائبات } مرتبہ جناب امۃ الکریم بیگم اسحٰق اقتصاصہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۸، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مصنفہ معرفت عائشہ باوانی وقف، بنک ہاؤس نمبر ا- حبیب اسکوائر، بندر روڈ، پوسٹ بکس ۴۹۸۰ کراچی ۲۔

مصنفہ کے بیان کے مطابق یہ کتاب قرآن حکیم کے بعض اہم اور عجیب اشاروں کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، ان کے نزدیک ان اشاروں کو تشبیہ و تمثیل کہا گیا ہے، جن کا ذکر آیات متشابہات میں ہے، اور آیات متشابہات میں طرح طرح کی خبریں اور پیشین گوئیاں تشبیہوں اور مثالوں کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں، اور انکی تاویل کو اللہ کے علاوہ راسخون فی العلم بھی جانتے ہیں، ان کے خیال میں آج کل کے موجد و محقق سائنسدان آیات متشابہات کی عملاً مجسم تاویل بن گیے ہیں، جو ان میں اشارہ کیے گئے ایجادات و تحقیقات کو بحکم خداوندی کر کے دکھاتے جا رہے ہیں، اس کے ثبوت میں وہ سورۂ عنکبوت کی دو آیتیں پیش کرتی ہیں، لیکن ان کے استدلال کا نرالا انداز ہے، وہ عربی متن کے بجائے صرف اردو ترجمہ پر اکتفا کرتی ہیں، اور ترجمہ بھی انہی فقروں کا کرتی ہیں جن سے ان کا مطلب نکلتا ہو، اور جو حصے ان کے خلاف ہوتے ہیں، انہیں نظر انداز کر دیتی ہیں، نیز مطلب برآری کے لیے مقدم آیات کا ترجمہ موخر، اور موخر کا مقدم کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ قرآن مجید کی معروف قرأت کو بدل دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتیں، چنانچہ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا کو انہوں نے اذا تلھی کہہ کے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ ہم کو چاند کی اس حالت کی قسم جب کہ اس میں داخل

ہو کر آپس میں دلچسپ کھیل کھیلیں گے، اور ایک دوسرے کے بعد لگاتار آتے چلے جائیں گے، پانی نکالیں گے اور ہر قسم کے تلاش و تجسس میں رہیں گے، اور انتظارگاہیں بنائیں گے۔ اس سلسلہ میں تلھی کی جو صرفی بحث کی ہے وہ صرف و اشتقاق میں ان کی مہارت کا دلچسپ اور عجیب نمونہ ہے، وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ تسقیہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پانی بھرنے کا پیشہ، ان کے نزدیک اس میں ایک اشارہ یہ ہے کہ سمندر کا مد و جزر چاند کی کشش سے ہے، دوسرا اس بات کا کہ آیندہ چاند میں جا کر وہاں رہنے والوں کو پانی مل جائے گا، اور لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا میں چاند اور سیاروں کے سفر کا اشارہ ہے۔ ان کے خیال میں حواریین عیسیٰؑ سے سفید جلد والے یورپین یعنی سفید قومیں مراد ہیں، جن کے لیے سورۂ مائدہ میں آسمانی نعمتوں کا مجموعہ نازل کرانے کا ذکر ہے، چنانچہ بجلی، ہوا، سورج، چاند تمام آسمانی نعمتوں سے فائدے حاصل کر رہے ہیں، انسان کے خدا کا خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایسے کام کرنے چاہئیں جن سے کچھ تو خدا کا قرب نصیب ہو، چونکہ انبیاءؑ کی زندگی عام انسانوں کے لیے نمونہ ہے، اس لیے انھوں نے جس کام کا نمونہ دکھایا ہے، اسے انسان بھی کر سکتا ہے، وہ معجزے بھی دکھا سکتا ہے، آج سائنسدان جو ایجادات کر رہے ہیں، وہ عام لوگوں کے لیے معجزے سے کم نہیں ہیں، حضرت نوحؑ نے بڑا اور طاقتور بحری جہاز بنایا تھا، جو ان کا معجزہ تھا، اب ان کی اولاد سے بھی اللہ نے ایسے جہاز بنوا دئے، حضرت ابراہیمؑ کے لیے بھڑکتی آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی، حال میں ان کی اولاد نے ایسا لباس ایجاد کر لیا ہے جس کو پہن کر آگ کے الاؤ میں کود جائیں تو انسان کا ایک رواں بھی نہ جل سکے، حضرت موسیٰؑ کا ایک معجزہ ید بیضا تھا، اس سے اشارہ بجلی کی روشنی کا ہے، معلوم ہوا کہ بجلی کی ایجاد کسی یہودی سائنسداں نے کی ہے، حضرت داؤدؑ کی آواز کی دلکشی، چڑیوں کے جمع ہونے اور ان کے لیے لوہے کے نرم کیے جانے جیسے معجزوں سے ان کا تار برقی، ٹیلیفون اور ریڈیو کا موجد ہونا ثابت ہوا،

آج یہ ایجادیں یہودیوں اور عیسائیوں ہی سے کرائی جارہی ہیں، کیونکہ حضرت داؤدؑ بنی اسرائیل ہی سے تھے، حضرت سلیمانؑ کیلئے تانبے کا چشمہ بہا دینا اس کا ثبوت ہے کہ اب حضرت داؤدؑ کے بنائے ہوئے لوہے کے تاروں کے بجائے تانبے کے تار سب جگہ پھیلا دیئے گئے، محاریب و تماثیل سے سینما اور ٹیلی ویژن کی طرف اشارہ ہے، حضرت عیسیٰؑ کے اندھوں کو آنکھ والا بنانے کا معجزہ آج عیسائی اس طرح دکھا رہے ہیں کہ پیدائشی اندھوں کی آنکھوں کے گڑھوں میں دوسرے انسانوں کی آنکھیں لگا دینے سے ان کو بینائی مل جاتی ہے، مصنف کو امت محمدیہ سے یہ گلہ ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کے نمونہ پر عمل کرکے ویسے معجزے نہیں دکھا رہی ہے، تاہم گذشتہ زمانہ کے مسلمانوں نے تسخیر کائنات سے متعلق آیتوں پر غور کرکے ایسی ایسی تحقیقات کیں، اور سائنس کے وہ فارمولے ایجاد کیے، جن کی بنیاد پر آج کے سائنسدانوں نے سائنس کی عظیم الشان عمارت کھڑی کی ہے، پوری کتاب اسی قسم کے انکشافات اور عجائب سے بھری ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ مصنف کے بقول قرآن سمجھنے کے لیے کسی لمبی چوڑی علمیت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف مفتاح القرآن (جس کا بہتوں نے نام بھی نہ سنا ہوگا) جیسی لغت سے یہ سارے حقایق منکشف ہو سکتے ہیں، قدیم کتب لغت و تفسیر اور تراجم قرآنی اس کیلئے بالکل غیر موزوں ہیں، دراصل مصنف کی بنیاد ہی غلط اور خشت اول کج ہے، اس لیے تا ثریا می رود دیوار کج، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ آیات متشابہات کی تاویل کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اس نے راسخین فی العلم کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ متشابہ اور محکم سبھی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، باقی جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور فتنہ انگیزی ہوتی ہے وہی متشابہات کے درپے ہوتے ہیں، قرآن مجید سائنس اور جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ ہر نئی تحقیق کا خواہ مخواہ اس سے پتہ لگایا جائے، بلکہ وہ صحیفۂ ہدایت ہے، جو لوگ نیک نیتی اور ہدایت طلبی کے جذبہ سے اسے پڑھیں گے، انہی کو اس کا کچھ علم حاصل ہوگا، اس کا کچھ لکھنا لکھانا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، ہر بوالہوس کو اسے تختۂ مشق نہیں بنانا چاہیے، قرآن مجید

کے ساتھ اس سے بڑا مذاق اور کیا ہوگا کہ جو عربی کے معمولی الفاظ اور صیغے تو کجا، اردو بھی صحیح لکھنا نہ جانتا ہو وہ بقلم خود مبلغ و مفسر قرآن ہو جائے، ع: ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا،

اسلامی سیرت و اخلاق: مترجمہ مولوی شمس الحق ندوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ: اسلامک بک سنٹر، مکارم نگر، لکھنؤ

شیخ محمد بن احمد بن حسن خزرجی ابوظبی کے خطیب و عالم اور وزارۃ العدل والشؤون الاسلامیہ والاوقاف کے مستشار ہیں، یہ ان کے جمعہ کے خطبوں کا اردو ترجمہ ہے، اس میں انہوں نے کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، حج، مسجد، عشرۂ ذی الحجہ، ماہ شعبان، اسراء و معراج، ربیع الاول اور علم و علماء کی فضیلت و اہمیت بیان کی ہے، شیخ مسلمانوں کے موجودہ دینی و اخلاقی انحطاط سے بہت متاثر اور مغموم ہیں، اس لیے انہوں نے انہیں اسلامی سیرت و اخلاق اختیار کرنے کی خاص طور پر تاکید کی ہے، اس سلسلہ میں جہاں خوف و خشیت الٰہی اور ایمان کے تقاضے پورا کرنے کی دعوت دی ہے، وہاں دنیا کی زیب و زینت میں پڑکر آخرت سے بے پروا ہونے سے روکا ہے، اور شادی کی ضرورت و مصلحت بھی بیان کی ہے، اور زنا و شراب نوشی کے مفاسد بھی واضح کیے ہیں، تاکہ ایک اچھا اور پاکیزہ ماحول وجود میں آئے، گو ان خطبوں میں ایک مستقل تصنیف کی طرح ربط و ترتیب نہیں ہے، تاہم ان مفید باتوں سے مسلمانوں کو عملی زندگی میں بڑی رہنمائی ملے گی، مولانا شمس الحق ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے خطبوں کا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے وہ لائق تحسین ہیں، مگر انہوں نے قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے یا تو آزادانہ کیے ہیں، یا کسی ایک ہی ترجمہ کو سامنے رکھا ہے، اس لیے بعض جگہ مفہوم کی پوری وضاحت نہیں ہوئی ہے، اور کہیں کہیں غلطی بھی ہو گئی ہے جیسے كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (یہ اللہ کو بہت ناپسند ہے کہ تم کہو اور کرو نہ کچھ، صفحہ ۱۶) اور نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (صفحہ ۹۶) میں فی الآخرہ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے، صفحات ۵۸ تا ۶۲ درست نہیں لگے ہیں،

کامٹی کی ادبی تاریخ:- مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۶، مجلد مع حسین گردپوش، قیمت ۲۵.۰۰ روپے، پتہ:- بزم غالب کامٹی، ضلع ناگپور، ۴۴۱۰۰۱، مہاراشٹر۔

یہ کتاب مصنف کے تحقیقی مقالہ "ناگپور میں اردو" کا ایک حصہ ہے، جو کامٹی کی گذشتہ سو برس کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی داستان ہے، شروع میں کامٹی کی مختصر تاریخ اور وہاں اردو کی ترویج کا ذکر ہے، اس کے بعد کامٹی میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقا، کا اجمالی حال، اور شعراء کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا ہے، ان کے حالات و کمالات کے علاوہ ہر ایک کی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے اور نمونۂ کلام بھی دیا ہے، دوسرے حصہ میں نثری ادب کا جائزہ لیا ہے، اور کچھ اہل قلم کے حالات اور خدمات ادب بیان کیے ہیں، اسکے بعد کامٹی سے شایع ہونیوالے اخبار اور رسالوں کے متعلق معلومات درج ہیں، نیز ان ادبی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کا ذکر ہے، جنہوں نے شاعروں اور ادیبوں کی نشوونما میں حصہ لیا ہے، آخر میں وہاں ہونیوالے بعض مشاعروں کی روداد تحریر کی ہے، یہ کتاب مرتب کر کے مصنف نے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے، ص ۳۵ پر عبدالشکور قلزم کے ایک مصرعہ میں "طبع" کو مذکر باندھا ہے، ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو، ایک جگہ بہادر گنج کو اعظم گڈھ کا قصبہ بتایا ہے (ص ۸۵) حالانکہ یہ غازیپور میں ہے، ایک اور جگہ غازیپور (ضلع اعظم گڈھ) لکھا ہے (ص ۲۳) غازی پور تو خود ہی ضلع ہے،

چند ارباب کمال:- مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۸، قیمت پچیس (۲۵) روپیے، پتہ:- ضیاء الدین اصلاحی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ،

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں عربی شعر و ادب کی تین ممتاز شخصیتوں جاحظ، ابو العلاء معری اور امرؤ القیس کا تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ و منتسبین میں مولانا عبدالماجد دریابادی، اقبال سہیل، مرزا احسان احمد اور مولانا مسعود علی ندوی کی شخصیت و کمالات پر بحث کی گئی ہے، اسکے بعد تین علمی تعلیمی اشخاص ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا مفتی محمد شفیع اور قاضی محمد عادل عباسی کے متعلق تاثرات قلمبند کیے گئے ہیں، آخر میں اردو کے ایک محقق امتیاز علی عرشی اور ایک نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے علاوہ دو ہندو محسنین اردو منشی دیا نرائن نگم اور منشی نول کشور کا ذکر ہے، "ض"